کوئی مضمون لکھا تھا جس میں ان کے دعوائے مہدویت کی غلطی اور ان کے مامور من اللہ ہونے کی پرزور تردید کی تھی، البتہ ان کو زاہد و متقی عالم تسلیم کیا تھا، مگر فرقہ مہدویہ کے ماننے والوں کو اس سے تکلیف پہنچی اور انھوں نے اس کے جواب میں آیات جلی کے نام سے یہ کتابچہ لکھ ڈالا ہے، اکثر علماء نے انکی تکفیر تک کی ہے، اور کسی نے بھی ان کو مہدی موعود تسلیم نہیں کیا ہے، اس لیے مدیر تجلی نے اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں لکھی ہے، بلکہ ہندوستان کے علماء کی وکالت کی ہے، اس لیے ان حضرات کو اس عقیدہ کے ماننے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

کلیات افسوس ۔ از میر شیر علی افسوس، مرتبہ سید ظہیر احسن، صفحات ۳۵۲،
کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، قیمت درج نہیں،

میر شیر علی افسوس بارہویں صدی کے نصف آخر کے ممتاز شعراء میں ہیں، میر حسن اور لطف وغیرہ نے بڑے اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، یہ متعدد نوابوں اور رئیسوں کے یہاں رہ چکے تھے، ان کا دیوان جس میں تقریباً ۱۱-۱۲ ہزار اشعار ہیں، اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے، مگر اب اسے دوبارہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ نے تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، افسوس نے غزل اور قصیدہ سے لے کر مخمسات اور واسوخت وغیرہ ہر صنف میں شعر کہے ہیں، اور دیوان میں یہ سب موجود ہیں، اس دور کا جو عام رنگ تھا، وہ ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے، ادارۂ تحقیقات کی یہ خدمت قابل قدر ضرور ہے، مگر ضرورت تھی کہ مرتب اس پر ایک پُر مغز مقدمہ لکھتے، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی طباعت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتے، اس کے دیکھنے سے افسوس کے بارے میں اتنا بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس عہد کے شاعر تھے،

م ۔ ع

جلد ۹۷ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۶ء نمبر ۳

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۱۶۴-۱۶۲

مقالات

سولھویں اور سترھویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۱۹۶-۱۶۵

ہندی شاعری کا تاریخی جائزہ — جناب زیدی جعفر رضا صاحب، ایم اے شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۲۰۹-۱۹۷

دیوان راقم — جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی — ۲۱۷-۲۱۰

تاریخ پیدایش و وفات حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ — جناب سید وحید اشرف صاحب شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۲۲۴-۲۱۸

تلخیص و تبصرہ

امریکہ میں اسلام — "ض" — ۲۳۲-۲۲۵

ادبیات

دعوت حق — جناب پروفیسر سید حسن صاحب، صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ — ۲۳۳

غزل — جناب یعقوب بدایونی — ۲۳۴

" — جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری — ۲۳۵-۲۳۴

" — جناب مولوی عثمان احمد صاحب جونپوری — ۲۳۵

مطبوعات جدیدہ — "م ۔ ع" — ۲۳۹-۲۳۶

(تصحیح:۔ اس شمارہ کے ص ۱۹۶ کی سطر ۹ میں اہلبیت کے بجائے اہلیبت بنالیں)

شذرات

بیروت کے دارالکتاب العربی اور تہران کی دانش گاہ نے دارالمصنفین سے علمی اور ثقافتی تعلقات و تعاون پیدا کرنے کی خاطر اپنی مطبوعات بھیجی ہیں، بیروت سے جو عربی کتابیں آئی ہیں ان میں ایک تو ابناء السندباد مؤلفہ آلان فالیارس ہے، تین کتابیں الکویت کے نام سے ہیں، جن کے مؤلف قدری قلعجی ہیں، ایک کتاب الکویت کانت منزلی مؤلفہ زہرۃ دکیسون فریث ہے، مؤخر الذکر چاروں کتابوں میں کویت کے تاریخی، اقتصادی اور تجارتی حالات سے متعلق مفید معلومات ہیں، تہران یونیورسٹی سے فہرست مقالات فارسی (بکوشش ایرج افشار) حدود العالم (بکوشش دکتر منوچہر ستودہ) ورقہ و گلشاہ (باہتمام دکتر ذبیح اللہ صفا)، سمک عیار جلد اول و دوم، تالیف فرامرز خداداد ابن عبداللہ الکاتب الارجانی (بامقدمہ و تصحیح پرویز ناتل خانلری) موصول ہوئی ہیں، فہرست مقالات فارسی میں مفید تاریخی، ادبی، مذہبی اور جغرافیائی مضامین کی کتابیات ہیں، حدود العالم ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے جس سے اہم جغرافیائی معلومات حاصل ہوتے ہیں، ۱۳۵۲ھ میں یہ تہران میں طبع ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ اسکو بڑے اہتمام کے ساتھ تہران یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، دارالمصنفین نے بھی ان اداروں کے جذبۂ خیرسگالی کا قدردان اور ممنون ہو کر ان کے پاس اپنی مطبوعات بھیجی ہیں اور آیندہ بھی جاتی رہیں گی اسی طرح امید ہے کہ دارالمصنفین کے گوشہ نشین اہل قلم بھی ایران اور عرب ممالک سے ہندوستان کے خوشگوار ثقافتی تعلقات پیدا کرنے میں معاون ہونگے،

ہندوستان میں حال کی مفید فارسی مطبوعات میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے ہفت اقلیم مؤلفہ امین احمد رازی حصہ دوم (اقلیم ثالث) کی اشاعت ہے، یہ کتاب ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں لکھی گئی، مصنف شاہ طہماسپ کی طرف سے وزیر اصفہان تھا، جو ایک دیدہ ور اہل علم بھی تھا، اسکی یہ کتاب جغرافیائی،

تاریخی، علمی اور ادبی معلومات کے لحاظ سے ایک انسائیکلوپیڈیا بنگئی ہے، اس میں سلاطین و امراء کے تذکرے کے علاوہ فارسی مصنفوں اور شاعروں کے حالات بھی ملتے ہیں، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے اسکے تین حصے پہلے شائع ہو چکے تھے، اب اسکا چوتھا حصہ ڈاکٹر محمد اسحق نے اڈٹ کیا ہے، جن کو فارسی زبان سے کسی بڑے سے بڑے محب وطن ایرانی سے کم محبت نہیں، وہ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے بانیوں میں بھی ہیں، انکی نگرانی میں انگریزی رسالہ انڈو ایرانیکا گذشتہ بیس سال سے نکل رہا ہے، اسکے ذریعہ سے ہندوستان میں فارسی زبان کی جو خدمت ہو رہی ہے وہ سراسر ڈاکٹر صاحب موصوف کی رہین منت ہے، اسکی بدولت وہ زندہ جاوید ہو کر رہیں گے، ہفت اقلیم جلد دوم اقلیم ثالث کو انھوں نے بڑی محنت اور مشقت سے اسوقت اڈٹ کیا جب وہ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، اسکی اشاعت سے اہل علم ان کے اور بھی زیادہ ممنون ہیں، اس میں ایران، کابل اور دوسرے ممالک کے علاوہ لاہور، سرہند، ہانسی، تھانیسر، پانی پت، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، اودھ، کالپی اور متھرا کے تقریباً ۱۵۰ شعراء، علماء اور دوسرے مشاہیر کے مختصر اور مفید حالات اور انکی شاعری کے نمونے ملیں گے۔

گذشتہ مہینہ گیکواڑ اورینٹل سیریز بڑودہ کی طرف سے مرآۃ احمدی مؤلفہ مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر کا انگریزی ترجمہ موصول ہوا، جو ۹۴۶ صفحے پر مشتمل ہے، کچھ دنوں پہلے اسی ادارہ کی طرف سے مرآۃ احمدی کے فارسی نسخے شائع ہوئے تھے، مغل بادشاہوں کے دور کے گجرات کی سب سے اہم اور مستند تاریخ ہے، اسکا مصنف مرزا محمد حسن اورنگزیب کے عہد میں گجرات کا دیوان رہ چکا تھا، اس نے یہ کتاب لکھکر وہی مفید تاریخی خدمت انجام دی ہے جو ابوالفضل نے آئین اکبری لکھکر دی ہے، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ پوری محنت اور لیاقت سے محمد اف۔ لوکھنڈوالا صدر شعبۂ فارسی بڑودہ یونیورسٹی نے کیا ہے، ہندوستان اور خصوصاً گجرات پر کام کرنے والے مورخین کو جو فارسی نہیں جانتے ہیں، اس ترجمہ سے بڑی مدد ملے گی، اسکے لیے فاضل مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں،

ہندوستان میں جو فارسی تاریخیں لکھی گئیں ان میں بہت سی تاریخوں کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں جس دیدہ وری سے راورٹی نے طبقات ناصری، اے، ایس بیورج نے بابر نامہ اور ہمایوں نامہ، ایچ بیورج نے اکبر نامہ، بلاخمن اور گلیڈون نے آئین اکبری اور رینکنگ نے منتخب التواریخ کے ترجمے کرکے ان پر جو حاشیے لکھے ہیں، ان کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، اس علم دوستی سے انگریزی زبان بھی مالا مال ہوتی رہی، لیکن اسی کے ساتھ افسوس و ندامت ہے کہ اب تک ان

فارسی تاریخوں کے اردو ترجمے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں ہوئی ہے، دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی (عفیف) آئین اکبری، اقبال نامۂ جہانگیری اور مآثر عالمگیری کے اردو ترجمے ضرور ہوئے، لیکن جو محنت انگریزی ترجموں کی ہے وہ ان اردو ترجموں میں نظر نہیں آتی ہے۔ ان میں ترجمے کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں، بعض جگہ اردو عبارت کو رواں کرنے کے لیے ایسے ترجمے کیے گئے ہیں جو اصل سے بالکل مختلف ہیں، اب جبکہ ہماری نسلیں فارسی زبان سے بیگانہ ہوتی جارہی ہیں، ضرورت ہے کہ ہمارا قیمتی تاریخی سرمایہ جلد از جلد اردو میں منتقل ہو جائے، یہ بڑا کام حکومت کی سرپرستی ہی میں انجام پاسکتا ہے، ہندوستان میں کچھ ادارے تو حکومت کی طرف سے ایسے ضرور ہیں جہاں سے فارسی اور عربی کی کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے لیکن جب تک اردو کو وہ باعزت جگہ نہ ملے جس کی وہ خواہاں ہے، شاید اردو میں فارسی تاریخوں کے اردو ترجمے کا انتظام حکومت ہند کی طرف سے مستقبل قریب میں نہ ہو سکے۔ ہندوستان کے علمی اداروں میں بھی یہ کام ہونا مشکل ہے، پاکستان میں اردو قومی اور سرکاری زبان ہے، اگر وہاں یہ کام شروع کر دیا جائے تو اس سے ہندوستان کے ارباب علم و تحقیق بھی مستفید ہوں گے۔

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دار المصنفین و مدیر معارف زیارت خانہ کعبہ کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے ہیں، جہاں سے ان کا جہاز ۳ اپریل کو جدہ جائیگا، حج کے بعد وہاں سے واپسی مئی کے آخر میں ہوگی، دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالے ان کے اس مقدس سفر کو قبول فرمائے اور وہ اپنے ساتھ خیر و برکت لاکر دار المصنفین کی خدمت پورے دینی ولولے اور علمی حوصلے کے ساتھ ایک مدت مدید تک انجام دیتے رہیں۔ آمین

ہندوستان و پاکستان کے درمیان ڈاک جاری ہو گئی ہے، معارف کے وہ تمام پچھلے پرچے جو پاکستان کے خریداروں کو جنگ کی وجہ سے نہ بھیجے جا سکے۔ ان کے نام سے دفتر میں محفوظ ہیں، مارچ کا معارف ان کے پاس پہنچ جائے تو دفتر کو ضرور مطلع کریں تاکہ پچھلے پرچے ان کی خدمت میں روانہ کر دیے جائیں۔

مقالات

سولھویں اور سترہویں صدی میں
شمالی ہند میں
مسلمان مجددوں کی تحریکیں

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "سولھویں اور سترہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں" ہے، اس کی ضخامت ، ۹۴ صفحے ہے، لیکن قیمت تیس روپئے ہے، اور بال کرشن کمپنی حضرت گنج سے ملتی ہے، مصنف کا نام سید اطہر عباس رضوی ہے، نام کے آگے ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ، ڈی ۔ لٹ ۔ ان ۔ آر ۔ ایس وغیرہ بھی لکھا ہوا ہے، اس وقت وہ جموں اور کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ریڈر اور صدر بھی ہیں، یہ کتاب آگرہ یونیورسٹی میں ڈی ۔ لٹ کی ڈگری کے لیے پیش کی گئی تھی، جس سے مصنف سرفراز بھی کئے گئے ہیں،

کتاب کے آغاز میں مصنف کی تمہید ہے، پھر پروفیسر محمد حبیب (سابق استاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے قلم سے پیش لفظ ہے، اس کے دس ابواب ہیں (۱) تیرہویں صدی سے سولھویں صدی تک ہندوستان میں تصوف (۲) تحریک مہدویت (۳) مہدوی دائرے (۴) مذہبی علوم کے

مطالعہ کا احیاء (۵) سلسلۂ نقشبندیہ (۶) مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششیں (۷) مجددی تحریک کا
انجام (۸) سترہویں صدی میں وحدت الوجود اور ثقافتی میل جول (۹) مجدد کے جانشین (۱۰)
تبصرہ اور تتمہ۔

اس کتاب کی تدوین کا اصلی مقصد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلاف زہر افشانی کرنا ہے، (ملاحظہ ہو
شذرات معارف جنوری ۱۹۶۶ء) لیکن اس مقصد پر پردہ ڈالنے کے لیے مصنف نے اپنی کتاب
میں مذکورہ بالا ابواب مصلحتاً شامل کر دیے ہیں، اس کتاب کی ترتیب میں مصنف کے بڑے مشیر ڈاکٹر
نور الحسن صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی رہے ہیں، جیسا کہ تمہید سے ظاہر ہے، ڈاکٹر نور الحسن یورپ کی تمام
تحریکوں سے تو ضرور واقف ہوں گے، لیکن ان کا ہندوستان کی مذہبی تحریکوں کا مطالعہ مطلق نہیں،
پھر ظاہر ہے کہ انھوں نے مصنف کو کیا مدد دی ہوگی، البتہ اس کتاب کے لکھنے میں جو اسپرٹ کام
کر رہی ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا مشورہ ضرور مفید ثابت ہوا ہوگا۔

مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تیاری میں لندن، اکسفورڈ، کیمبرج، مانچسٹر،
اڈنبرا، پیرس، ماربرگ، کولون، بون، توبن جن، فرینکفورٹ، وورزبرگ، ہیمبرگ، ہیڈل برگ،
برلن، میونخ، مشرقی برلن، ویانا، زیورچ، اسٹرڈم، لیڈن، ہیگ، ایتھنس، روم، استنبول،
دمشق، بغداد، نجف، کربلا، طہران، مشہد اور کابل کے کتب خانوں کی بھی خاک چھانی ہے، ظاہر ہے کہ
اس کتاب میں ہندوستان کے جن بزرگان دین کا ذکر آیا ہے ان کے جلوے تو مصنف ان جگہوں میں
دیکھنے سے قاصر رہے ہوں گے، البتہ انھوں نے یورپ کی سیر و تفریح میں "فرنگ دل کی خرابی" ہی
کو اپنے "خرد کی معموری" سمجھ لیا ہے، اس لیے ان کی کتاب میں اسلام کے معاند عیسائی مبلغوں
اور عیب جو مستشرقوں کا جو تحقیقاتی رنگ غالب آگیا ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مصنف نے کتابیات کی جو فہرست دی ہے، اس کو دیکھ کر پہلی نظر میں ناظرین حیرت زدہ ہوکر
رہ جائیں گے، کیونکہ ۲۴۰ صفحے کی کتاب کے لیے کتابیات کی فہرست ۲۵ صفحے میں درج ہے، جن میں مختلف
زبانوں کی کتابیں شامل ہیں، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلبہ اپنے ممتحنوں اور پڑھنے والوں کو متاثر
کرنے کے لیے ایسی ایسی کتابوں کے نام بھی درج کر دیا کرتے ہیں جو ان کی نظر سے مطلق نہیں گزرتیں، زیر نظر
کتاب میں کتابیات کی فہرست بھی اسی نہج کی ہے، مثلاً کتابیات میں شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ،
عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، الانصاف فی بیان اصحاب الاختلاف، الارشاد الی مہمات
الاسناد، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، القول الجمیل، پھر فتاوی عالمگیری اور دار المصنفین کی
مطبوعات میں سیرۃ النبی، خلافت اور ہندوستان، اور المامون وغیرہ کے نام بھی موجود ہیں،
ان کتابوں کے حوالے کس سلسلے میں آئے ہیں، یہ مصنف کی کتاب کے حواشی میں نظر نہ آیا،
اگر کتابیات کے یہ معنی ہیں کہ مصنف نے اپنی زندگی میں جتنی کتابیں پڑھیں یا صرف کیٹلاگ میں انکے
نام دیکھ لیے تو پھر یہ فہرست مختصر ہے، اس کو اور بھی طویل ہونا چاہیے تھا،

مصنف نے اپنی کتاب میں عربی ماخذوں کی بھی فہرست دی ہے، ان کا انداز تحقیق بتاتا ہے
کہ وہ عربی مطلق نہیں جانتے، کیونکہ جن بزرگان دین کے حالات عربی ماخذوں سے معلوم کیے جا سکتے
تھے، ان کے حالات انگریزی کتابوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً وہ حسن بصریؒ
اور ابراہیم بن ادہمؒ کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ذریعہ سمجھے ہیں، اور رابعۃ العدویہ کی عظمت
کا اندازہ مارگریٹ اسمتھ کی ایک انگریزی کتاب کے سہارے کیا ہے (ص ۲) شیخ شہاب الدینؒ
کی عوارف المعارف کا مطالعہ ایچ، ڈبلیو، کلارک کی عینک سے کیا ہے (ص ۶) مقدمہ ابن خلدون
ان روزن تھال سے سمجھا ہے (۶۹ و ۷۸ و ۱۲۶) سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ
مصنف نے وحدۃ الوجود پر جو کچھ لکھا ہے، وہ گویا ان کی نظر میں حرف آخر ہے، لیکن ابن العربی
کو سمجھنے کے لیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور عفیفی کی ایک انگریزی کتاب سے مدد لی ہے (ص ۳۲۵)

ابن تیمیہ کو محمد یوسف کوکن عمری کی اردو کتاب امام ابن تیمیہ کے ذریعہ سمجھے ہیں (ص ۹۳) سفر نامہ ابن بطوطہ کا مطالعہ کرنے میں ایک یورپین مصنف کی مدد لی ہے، وغیرہ وغیرہ، پھر بھی انھوں نے اپنی کتاب میں بلا تکلف عربی کی چوبیس کتابوں کے نام گنوا دیے ہیں، جن کو دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ یہ تمام کتابیں مصنف نے کھنگالی ہوں گی، مصنف کے عربی نہ جاننے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ عربی الفاظ کو انگریزی املا میں صحیح طور پر نہ لکھ سکے ہیں جس کے لیے دیباچہ میں معذرت بھی کی ہے۔

مصنف تھوڑی بہت فارسی تو ضرور جانتے ہیں، لیکن اتنی نہیں جتنی کہ اس کتاب کے اہم موضوع کے لیے ضروری ہے، انھوں نے کشف المحجوب کو سمجھنے کے لیے اے، آر، نکلسن کا ترجمہ سامنے رکھا ہے (ص ۳۳ و ۹) جلال الدین رومی کے مطالعہ کے لیے بھی نکلسن ہی کے دامن میں پناہ لی ہے (ص ۵) نفحات الانس میں وحدۃ الوجود کی جو بحث ہے، اس کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی اور تزک جہانگیری سے استفادہ ان کے انگریزی ترجموں سے کیا ہے، (ص ۴ ۱۸ اور ۹، ۸ وغیرہ) عراقی کو اڈورڈ براؤن کے انگریزی ترجمہ سے سمجھے ہیں (ص ۳۴) اسی طرح عراقی کی کتاب لمعات کی اہمیت کا اندازہ اڈورڈ براؤن کی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" سے لگایا ہے (ص ۴۴) اس کے بعد ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے عمومًا خصوصًا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات جیسی مشکل اور ادق تحریر اور اس کے عمیق عارفانہ مسائل کو سمجھنے میں مصنف کے مبلغ علم نے کہاں تک مدد دی ہوگی، اڈیٹ کے مقالہ کی ترتیب میں ترجموں سے مدد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس مبلغ علم کے بعد بھی پروفیسر محمد حبیب نے پیش لفظ میں مصنف کو مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ سے بھی زیادہ بہتر مصنف اور محقق قرار دیا ہے اور مصنف کو بھی اس کا یقین ہے، چنانچہ اس سند کو انھوں نے اپنی کتاب میں بغیر کسی انکسار کے شامل کر دیا ہے، لیکن یہ سند ان کے گلے کا مرصع کار نہیں بلکہ ضعیف بنکر رہ جائے گی،

پروفیسر حبیب رقمطراز ہیں کہ میرے لیے ایسے الفاظ کا تلاش کرنا مشکل ہے جن کے ذریعہ اس غیر معمولی تصنیف کی تعریف کا حق ادا کر سکوں، یہ انڈو مسلم کے اس نصب العین کا بے مثال مطالعہ ہے جو دو صدیوں پر مشتمل رہا، ازمنہ وسطی یا موجودہ دور کی کوئی تصنیف بھی اس معیار کی نہیں" ناظرین اس مداحانہ سند کو سامنے رکھیں، اور مصنف نے اپنی کتاب کے پہلے باب میں تحقیقات کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ مطالعہ کریں پھر اس پوری کتاب کی حیثیت کا اندازہ لگائیں۔

پہلا باب تمہید کے طور پر "ہندوستان میں تصوف" کے عنوان سے، ۱۶ صفحہ پر مشتمل ہے، یہ حصہ اگر یورپ یا امریکہ کی کسی یونیورسٹی کے جلسہ میں پڑھا جائے، جہاں کے حاضرین تصوف سے بالکل ناآشنا اور ناواقف ہوں تو وہاں اس کی داد ضرور ملے گی، لیکن ہندوستان میں جو شخص بھی تصوف سے تھوڑا بہت آشنا ہے، اس کو پڑھکر یہ فیصلہ کرے گا کہ اس باب میں سب کچھ ہے مگر ہندوستان میں اصلی تصوف کا نہ گہرا مطالعہ ہے اور نہ مورخانہ تجزیہ، اس میں مصنف نے اپنے حسب منشا تصوف کی ایک جھاڑی سی تیار کی ہے جس میں ان کے قلم اور خیال کے دو خرگوش ایک ساتھ دوڑتے پھرتے ہیں، وہ ایک ہی دوڑ میں کبھی بغداد کبھی شام کبھی مصر، کبھی یونان، کبھی بودھ مذہب اور ویدانت کے ماننے والوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اس دوڑ کا نام انھوں نے تحقیقات رکھا ہے، جس کے آخر میں ان کو اپنے اندرونی اور مشتعل جذبات کے اظہار کا موقع ملا ہے، مثلاً تصوف کے تجزیہ کے سلسلہ میں اس عہد کے علماء کی سرگرمیوں کا خلاصہ یہ پیش کیا ہے،

"علما ہمیشہ ان ذرائع ہی کی تلاش میں رہے جن سے ان کی عزت بڑھتی رہے، اور وہ وہی معاشرتی فوقیت حاصل کریں جو برہمنوں یا عیسائی پادریوں کو حاصل ہے، لیکن ان کو یہ فوقیت شریعت اور سنت کی رو سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، جن کی وہ تبلیغ کرنے اور جس کی پابندی کرانا وہ اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے، اسی لیے وہ اپنی عزت اور خاص حقوق کی جعلی حدیثوں کو مشہور اور مقبول

کرانے ہی میں لگ گئے۔" (ص ۱۳)

علماء کے بعد صوفیائے کرام کی باری آتی ہے، اس "بے مثال" کتاب میں چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے تمام کارنامے کل سات آٹھ صفحوں میں سمیٹے گئے ہیں، جن میں تقریباً چار صفحے کے غیر ضروری حوالے بھی شامل ہیں، اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے:۔

"وسط ایشیا، غزنی، لاہور اور دہلی کے تھکا دینے والے سفر سے وہ تھک کر چور ہو گئے تھے، اس لیے انھوں نے اجمیر کو اپنی مستقل سکونت بنا لی، کیونکہ غالباً دہلی کی فضا ان کے لیے دم گھٹانے والی تھی، اس لیے وہاں ٹھہر نہ سکے۔" (ص ۱۴)

"وہ نہ کوئی مبلغ تھے اور نہ کرامات ئیے ... نہ انھوں نے عوام میں کوئی کام کیا، اور نہ کوئی کتاب لکھی ان کے بعد ان کے اور ان کے جانشینوں کے نام سے جعلی صوفیانہ کتابیں لکھی گئیں جو چودھویں صدی کے آغاز میں مقبول ہوئیں، اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھنے پر ادنیٰ درجہ کی صلاحیت کے سرگرم جانشینوں نے چشتیہ سلسلہ کے کارناموں کو بڑھانے کے لیے خواجہ معین الدین کے کارناموں اور تعلیمات کو خرافاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔" (ص ۱۵)

مصنف نے اپنے ذاتی مطالعہ کی بنا پر نہیں لکھا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا لٹریچر جعلی ہے، بلکہ پروفیسر حبیب کی سند پر یہ رائے قائم کی ہے، لیکن جب وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بھی اونچے درجہ کے اہل نظر اور محقق ہیں، تو ان کو خود اس کی تحقیق کرنا چاہیے تھا کہ یہ لٹریچر اصلی ہے یا جعلی، وہ بظاہر حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے معترف ہیں، اگرچہ منیری کے صحیح تلفظ سے بھی واقف نہیں لیکن حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے نہ صرف معدن المعانی بلکہ خوان پر نعمت (۸۰) مخ المعانی (ص ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۶، ۵۷) میں حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کو صحیح سمجھ کر ان کے حوالے دیے ہیں، لیکن مصنف حضرت شیخ

شرف الدین منیریؒ کے مصلحتاً معترف ہونے کے بعد ان سے بھی خفا ہو گئے ہیں کہ انھوں نے ان ملفوظات کو غیر مستند کیوں نہیں تصور کیا۔ (ص ۲۷)

مصنف نے بڑے یقین کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سنہ ولادت ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء اور سنہ وفات ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء لکھا ہے، (ص ۱۴) حالانکہ تذکرہ نویسوں نے ان کا سنہ وفات ۶ رجب ۶۳۲ھ اور ۶ رجب ۶۲۷ھ بھی لکھا ہے، ۶ رجب ۶۲۷ھ کی تاریخ وفات زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین کاکیؒ کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو ہوئی (ص ۱۶) اگرچہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کی وفات ۶ رجب ۶۳۳ھ تسلیم کر لی جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ان کی زندگی ہی میں رحلت فرما گئے تھے، حالانکہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد تک ان کے خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے ان کی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج فرماتے رہے۔

مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ شمس الدین التمش کے ابتدائی عہد میں اجمیر آئے، حالانکہ ان کے حالات کے قدیم ترین تذکرہ سیر الاولیاء میں ہے:

"حضرت سلطان المشائخ می فرمود چون حضرت شیخ معین الدین طاب اللہ مضجعہ در اجمیر آمد پتھورا رائے مملکت ہند در اجمیر بود چون شیخ در اجمیر سکونت ساخت پتھورا را و مقربان او را ناخوش آمد چون عظمت و کرامت شیخ معاینہ می کردند مجال دم زدن نبود۔" (ص ۴۶)

لیکن مصنف نے نہ صرف اس بیان کو رد کر دیا ہے بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں میں سے اخبار الاخیار اور گلزار ابرار کے مؤلفوں اور موجودہ دور کے مصنفوں میں سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر خلیق احمد نظامی سب ہی کے بیانات کو غلط بتا کر ایک ایسی کتاب کی سند پر سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں حضرت خواجہ معین الدینؒ کا اجمیر آنا لکھا ہے جو بہت بعد میں لکھی گئی، اس سے ثبوت فراہم کر کے مصنف نے

اپنے ناوکِ قلم سے سب کو بلا تکلف شکار کر دیا ہے، وہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کا کوئی لگاؤ سلطان شہاب الدین غوری سے دکھانا پسند نہیں کرتے، حالانکہ سیر الاولیا جیسے مستند تذکرہ میں ہے کہ جب پتھورا کی طرف سے حضرت خواجہ کو تکلیف پہنچی تو انھوں نے فرمایا،

"پتھورا را زندہ گرفتیم، و دادیم بہ لشکر اسلام، بعد از ان ایام لشکر سلطان معز الدین سام انار اللہ برہانہ از غزنی رسید و پتھورا مقابل لشکر اسلام شد و بدست سلطان زندہ افتاد (ص ۴۶)

اس طرح عام لوگ حضرت خواجہ اور سلطان شہاب الدین غوری کے تعلقات میں ایک روحانی لگاؤ محسوس کرتے ہیں، جس کو زائل کرنے ہی میں مصنف کو لذت ملی ہے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کے سلسلہ میں مصنف نے اپنی فارسی دانی کا بھی عجیب وغریب نمونہ پیش کیا ہے، انھوں نے صفحہ ۱۵ کے حاشیہ میں سیر العارفین کی ایک فارسی عبارت نقل کی ہے جس کے شروع میں ہے:-

"بیشترے کفار ازاں دیار بہ برکت آثار آں زبدۃ الاسرار بہ تشریف ایمان مشرف شدند و بیشترے کہ ایمان نیاوردند فتوح بحد و عد بحضرت ایشان فرستادند"

مصنف کا مضحک اصرار ہے کہ مذکورہ بالا عبارت میں "حضرت ایشان" حضرت خواجہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ حضرت خواجہ کے مقبرہ کے لیے ہے۔ کسی تذکرہ میں حضرت خواجہ کے مقبرہ کے لیے "حضرت ایشان" جیسے الفاظ نظر سے نہیں گزرے، سیر العارفین کے اردو ترجمہ مطبوعہ شمس المطابع میں بھی حضرت ایشان سے مراد حضرت خواجہ ہی لی گئی ہے (ص ۱۲) فارسی عبارت میں جہاں "حضرت ایشان" لکھا گیا ہے، وہاں آستانہ اور روضہ بھی لکھے ہوئے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ایشان مقبرہ کے لیے نہیں ہے، اس سلسلہ میں جو فارسی عبارت نقل کی ہے، اس میں معلوم نہیں "بدان عظ" "می بند" وغیرہ طباعت کی غلطیاں یا مصنف کی نارسی دانی کا نتیجہ ہے، پھر اسی عبارت میں بیشتری کفار،

Most of the prominent Hindus of that region نے مصنف نے امداد کا ترجمہ کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی نظر میں کفار اور ہندو دونوں ایک ہی چیز ہیں،

مصنف نے سماع کا ترجمہ گانے کے ساتھ رقص (Dance accompanied by singing) کیا ہے (ص ۱۶) جو ان کی جدت ہے، عربی لغت قاموس میں سماع کے معنی سننا لکھا ہے، اس طرح اردو لغت نور اللغات میں اسکے معنی سننا، ہر آواز جس کا سننا اچھا معلوم ہو، راگ سننا، جیسے محفل سماع وغیرہ میں لکھا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ محفل سماع میں رقص کیا۔ مزامیر کو بھی پسند نہ فرماتے تھے (دیکھو فوائد الفواد ص ۲۲۷، ۲۴۶، خیر المجالس مجلس ہشتم و اخبار الاخیار ص ۷۶)

مصنف کی زبان دانی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، فوائد الفواد کے ایک اقتباس کے انگریزی ترجمہ میں عالمِ سِفلی کو انگریزی میں Alam-i-Sufli لکھا ہے، سفلی میں کسرہ یعنی زیر ہے، اس کو فاضل مصنف نے بالضم یعنی پیش کے ساتھ لکھا ہے (ص ۱۸)

صوفیائے کرام پر لکھنے کے لیے بڑی شرط یہ ہے کہ لکھنے والا ان کے آداب، ظاہری اور باطنی معاملات، اطلاقات اور رموز و اشارات سے پوری واقفیت رکھتا ہو محض ذہنی عیاشی کیلئے قلم کی گل کاریاں نہ دکھاتا ہو، اور اگر صرف گل فشانی ہی مقصود ہو تو پھر کم از کم ادب شناس ہونا چاہیے، لیکن مصنف نے ان بزرگوں کے ذکر میں شائستہ طرز کے بجائے صحافتی انداز تحریر اختیار کیا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شان میں ان کے الفاظ ناظرین کی نظر سے گذر چکے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق لکھتے ہیں،

"ان کو شروع میں اقتدار اور فوقیت حاصل کرنے کے لیے سخت جد و جہد کرنی پڑی"۔ (ص ۱۹)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، کے حالات فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیا جیسی

مستند کتابوں میں مفصل مل جاتے ہیں، جن کے معترف پروفیسر محمد حبیب بھی ہیں، اور ان ہی کی مدد سے پروفیسر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پر مضامین بھی لکھے ہیں، لیکن ان کتابوں سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی جو صحیح تصویر سامنے آتی ہے وہ مصنف کو پسند نہیں آئی، اسی لیے وہ لکھتے ہیں:

"حضرت نظام الدین اولیاء کے جو حالات ہم کو ملتے ہیں وہ یا تو ان کے مریدوں یا معتقدوں نے لکھے ہیں، لیکن بہت سے موقعوں پر یہ حالات واقعیت پسندی سے خالی ہیں۔" (ص ۲۰)

معلوم نہیں واقعیت پسندی سے مصنف کی کیا مراد ہے، جو ان کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حالات میں نہیں ملتی، اس واقعیت پسندی کی آڑ میں ان کو بزرگوں پر کیچڑ اچھالنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے، ان کی نظر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا شاید بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے جماعت خانہ میں رہ کر جوگیوں کی تعلیمات سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا، (ص ۲۰) اسی طرح شاید ان کی نظر میں حضرت شیخ حمیدالدین صوفیؒ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے طریقے ہندو جوگیوں ہی کی طرح تھے، انھوں نے سبزی ہی پر اپنے کو محدود رکھا، ہندی اور ہندوی ان کے گھر کی بول چال تھی، (ص ۱۷) اگر مصنف کو ان بزرگانِ دین کے حالات میں اسی قسم کی واقعیت پسندی کی تلاش ہے تو ظاہر ہے نہ ملے گی۔

مصنف نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے مرشد یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی جانب زیادہ سختی سے راسخ العقیدگی کی طرف مائل تھے (ص ۲۱) گویا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت خواجہ نظام الدین چراغ دہلوی سے کم راسخ العقیدہ تھے، یہ وہی لکھ سکتا ہے جو پیری اور مریدی کے آداب سے بالکل ہی ناآشنا ہے۔

حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کی اصلاحات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"عملی طور پر .... ان کی اصلاحات نے

برف کے تودے کو زیادہ نہیں کاٹا، بلکہ ان اصلاحات نے ظاہر کر دیا کہ صوفیوں کا ایک گروہ اپنے ذہنی بحران کی وجہ سے زیادہ تر راسخ العقیدگی کی طرف مائل ہو رہا تھا، چشتی سلسلہ کی روایات رکاوٹ بنیں، اور شیخ نصیرالدین کچھ سطحی قسم کی مصالحت کرا سکے، لیکن انھوں نے واضح طور پر جوگیانہ حبس دم کی اہمیت ضرور ظاہر کر دی۔" (ص ۲۲)

مصنف کے نزدیک راسخ العقیدگی اور ذہنی بحران دونوں ایک ہی چیز ہیں، ان کے خیال میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کا بھی نمایاں کارنامہ جوگیانہ حبس دم کی اہمیت کا ظاہر کرنا تھا، چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات کو سمجھنے میں مصنف کا بہکا ہوا شعور مطلق کام نہیں دیتا ہے، چنانچہ پہلے تو وہ کہتے ہیں کہ چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ نے راسخ مذہبی تعلیمات کی ایسی سخت پابندی کی کہ تخلیقی فکر سرد پڑ کر رہ گئی (ص ۲۶)، اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی ضرور پابندی کی لیکن یہ ان کی اساسی تعلیمات کا جزء نہ تھا، ان کے نزدیک سچائی معرفت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے، لیکن انھوں نے سچائی کی نوعیت کی زیادہ فکر نہ کی، تصوف کی اصلی خصوصیت انفرادی تجربات سے حصول علم تھا، اس لحاظ سے مراسم، عقائد اور اخلاقیات کی جو غیر لچکدار باتیں تھیں وہ ان کے دائرہ سے خارج ہو جایا کرتی تھیں (ص ۲۶) گویا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ کے صوفیہ شرعی عقائد و اخلاقیات کے پابند تھے بھی اور نہیں بھی تھے، ایک الزام یہ بھی ہے کہ چشتیہ سلسلہ کی وجہ سے تخلیقی فکر سرد پڑ گئی، مصنف کے نزدیک تخلیقی فکر مسئلۂ توحید وجودی ہے جس کے علمبرداروں وہ بھگتی تحریک کے پیشواؤں کو بھی شامل کرتے ہیں، لیکن جب ان کا نزلہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ پر گرتا ہے تو وہ کہہ جاتے ہیں کہ چشتیوں کا مکمل نظام وجودی تھا جس کے خلاف خواجہ گیسو درازؒ رہے (ص ۵۴) یہی بھٹکا ہوا ذہن ان کی کتاب کی ہر سطر پر چھایا ہوا ہے، چنانچہ وہ لکھ گئے ہیں کہ حضرت خواجہ گیسو دراز، ابن عربی، فریدالدین عطار، اور جلال الدین رومی کی مذمت اسلام کے دشمن کی حیثیت سے کرتے تھے (ص ۵۵)

اس کے لیے انھوں نے مکتوبات گیسو دراز کے ایک قلمی نسخہ کا حوالہ دیا ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے، عام طور سے وہ جب بزرگان دین پر کوئی بہتان لگاتے ہیں تو کسی قلمی نسخہ کا حوالہ دے کر بڑھ جاتے ہیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قلمی نسخہ کی چھان بین کرنا ناظرین کے لیے ممکن نہ ہوگا، مگر یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے ان بزرگوں خصوصاً حضرت فریدالدین عطارؒ اور حضرت جلال الدین رومیؒ کو دشمن اسلام کہا ہوگا، مصنف اگر مکتوبات کی اصلی عبارت نقل کر دیتے تو پھر ان کا بیان قابل قبول ہو سکتا تھا، لیکن وہ تو سیاق و سباق حذف کر کے اپنے مطلب کی بات کہہ جانے میں ماہر ہیں،

مصنف نے سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں کا ذکر تین صفحوں میں کیا ہے، وہ ان تمام بزرگوں سے اس لیے خفا ہیں کہ ان کے پاس دولت بہت تھی، اور وہ حکومت کی ملازمت بھی قبول کرتے تھے، پھر مصنف کو اس کا بھی دکھ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود وہ بدکردار (Immoral) اور بدپرہیزگار (unscrupulous) قرار نہیں دیے گئے، (ص ۱۲)

ع - دراز دستی این کوتاہ آستیناں بیں

ان بزرگان دین میں مصنف کا نزلہ زیادہ تر حضرت جلال الدینؒ تبریزی پر گرا ہے، جن کے متعلق مصنف کا مطالعہ ہے کہ

"وہ احساس برتری کے مرض میں مبتلا رہے" (ص ۲۳)

شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغری کو ان سے دشمنی ہو گئی، اور انھوں نے ان پر زنا کا الزام لگایا، جس کے بعد ان کو دہلی چھوڑنا پڑا،" (ص ۲۳)

وہ اپنی کتاب میں ہر جگہ ذہنی بحران کے شاکی ہیں، لیکن خود ان کے ذہنی بحران اور انتشار کا حال یہ ہے کہ جس سیاق و سباق کے ساتھ ایک عارفانہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت کو

سمجھے بغیر اپنی بے باکانہ بلکہ گستاخانہ رائے کا اظہار کرتے جاتے ہیں، صغری کبری کچھ ہوتا ہے، لیکن نتیجہ وہ اپنے مطلب کا نکالتے ہیں، مثلاً فوائد الفواد میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل طریقت کی نماز کچھ اور ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ قاضی کمال الدین نے خواب میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو عرش پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اس روایت کی اصلی غرض و غایت تو مصنف کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن وہ چیخ اٹھے کہ اس سے ظاہر ہے کہ طریقت کو شریعت پر فوقیت حاصل ہے (ص ۲۴) وہ طریقت اور شریعت دونوں میں سے کسی کے بھی قائل نہیں، لیکن طریقت کی برتری اور شریعت کی ناکامی دکھانے میں ہمیشہ بے چین اور مضطرب نظر آتے ہیں،

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے متعلق مصنف کا ارشاد ہے:

"انھوں نے بہت بڑی دولت جمع کر رکھی تھی، جو ان کے معاصروں کے لیے شدید صدمے کا باعث تھا، لیکن وہ ان کو یہ جواب دیتے کہ سانپ اسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے جو افسون نہیں جانتا" (ص ۲۵)

چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں سے جو فیوض و برکات پہنچے ان پر مصنف نے یہ لکھ کر پانی پھیر دیا ہے کہ

"چشتیوں اور سہروردیوں نے دینی علوم کی راسخ تعلیمات کی ایسی سخت پابندی کی کہ تخلیقی فکر کی ساری سرگرمیاں بالکل سرد ہو کر رہ گئیں" (ص ۲۶)

ان کو شاید تخلیقی فکر قاضی رکن الدین ابو حامد محمد کی علمی سرگرمیوں میں نظر آئی، جنھوں نے ان کے بیان کے مطابق بھوجر برہمن سے یوگ سیکھا تھا، اور سنسکرت کی کتاب امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ کیا تھا، (ص ۲۰)

چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تعلیمات کے سرچشمے کے سوتے چشت اور بغداد ہیں، اس کے علاوہ ہندوستان میں تصوف کی پہلی کتاب کشف المحجوب لکھی گئی، جو تمام سلسلوں کے بزرگوں

میں مقبول ہوئی، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسی کو اسلامی تصوف تسلیم کیا گیا، اس میں فلسفہ، ویدانت اور یوگ کا رتی برابر اثر نہیں، آگے چل کر بعض صوفیوں پر ہندوستان کے مقامی اثرات ضرور پڑے جو محدود اور خارجی اثرات کہے جا سکتے ہیں لیکن مصنف کو یہ عمومی دعوی کرنے میں مطلق تامل نہیں ہوا ہے کہ صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے اعتقادات، نظام اور اداروں میں بڑی مماثلت تھی (ص ۲۸)

سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ذکر کے بعد مصنف نے قلندروں کا ذکر کیا ہے، جس کے خاص طور پر ذکر کرنے کا سبب سمجھ میں نہیں آیا، اگر صوفیوں کے اقسام بتانا مقصود تھا، تو پھر قلندریہ ہی کے ذکر پر اکتفا کیوں کی؟ اسی کے بعد مصنف کا قلم یکایک شیخ محی الدین ابن العربی اور علاء الدولہ سمنانی کی طرف مڑ جاتا ہے، وہ حضرت جعفر مکی، مسعود بیگ، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، اور حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو ابن عربی کے وحدت الوجود کا حامی بتاتے ہیں، ان بزرگان دین میں سے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے، وہ عجیب و غریب ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ہر بن مو سے عشق الٰہی، عشق رسول، عشق اسلام اور عشق شریعت اسلام کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، مصنف نے اگر واقعی ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے وہی وحشت پیدا ہو جاتی جو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے پیدا ہو گئی ہے، جن کے خلاف زہر افشانی کرنے کے لیے انھوں نے اپنی تحقیقات کے گپھاؤں میں اپنے کو گم کرنے کی کوشش کی ہے، وہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی تعلیمات کے معترف اس مصلحت سے ہو گئے ہیں کہ اپنے کو غیر جانبدار ظاہر کر کے دوسرے بزرگان دین کو مطعون اور اپنی کتاب کے ناظرین کو گمراہ کر سکیں، انھوں نے اس غیر جانبداری کی آڑ میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ ان کی خانہ ساز ہے، وہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی تعلیمات میں مطلق نہیں دکھائی دیتی ہے،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ امت محمدیہ میں ہونے کے لیے اتباع شریعت کو ہر حال میں ضروری

سمجھتے ہیں، راہ سلوک میں بھی شریعت کی پابندی کو لازمی قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ شریعت کے بغیر راہ سلوک میں قدم رکھنا جہالت اور ہلاکت ہے، حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ اور شریعت بغیر حقیقت کے نفاق ہے، جو شخص شریعت کا تابع نہیں ہوگا، اس کو طریقت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، شریعت کے بغیر طریقت ملحدین کا مذہب ہے، شریعت کے بغیر جو حقیقت حاصل ہو، اس پر خدا کی لعنت ہے، ظاہر بے باطن نفاق ہے، باطن بے ظاہر زندقہ ہے، اور شریعت بے باطن نقص ہے، نماز کو چھوڑ کر دائمی مشاہدہ کرنا یا فرائض شرعی کو ترک کر کے عالم ملکوت کو آشکارا دیکھنا یا انبیاء کے جوار مقدس میں ہونا ابلیسیت ہے، وہی علماء اور مشائخ سہرا بننے کے لائق ہیں جنھوں نے اپنے دم واپسیں تک آداب شریعت میں ایک ادب بھی ترک نہیں کیا، کتاب، سنت اور اجماع امت کی تقلید کو ہر حال میں ضروری قرار دیا ہے (تفصیل کیلیے دیکھو مکتوبات سہ صدی مطبوعہ نسخہ ص ۶۴، ۷۳، ۷۲، ۵۰۹ و معدن المعانی ص ۴۰، جلد اول وغیرہ)

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی تحریروں میں توحید وجودی کی بحث کا چمنستان بھی کھلا ہوا ہے، جو مصنف کے خود ساختہ وحدت الوجود کے خارستان سے بالکل الگ ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت سے مشاہدہ کرنا کہ فاعل حقیقی وہی ایک ذات ہے، یہ توحید عارفانہ ہے، جس کو "مقام ہمہ از وست" کہتے ہیں، مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ عالم جو آئینۂ حیرت ہے، اس کو نظر نہیں آتا ہے، ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری رہتی ہے، اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ اوست کہتے ہیں، فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مرتبہ ہے، جس کا نام الفناء عن الفناء ہے، اس مرتبہ میں سالک کو کمال استغراق میں اپنی فنائیت کی بھی خبر نہیں ہوتی، اور وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کر سکتا، اگر یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب سالک اپنے کو اور کل کائنات کو خدا کے دریائے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور

اس کو خبر نہیں ہوتی کہ کون اور کیا غرق ہوا، اس مقام تفرید میں پہنچکر سالک کو وحدت الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، اور وہ ایسا محو ہوجاتا ہے کہ اس کو اسم و رسم، وجود و عدم، عبارت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں ہوتا۔

اس جگہ حضرت مخدوم الملکؒ نے بطور انتباہ لکھا ہے کہ توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ، خدا خدا ہے، اس لیے انا الحق، سبحانی ما اعظم شانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں، اور میری شان کس قدر بڑی ہے) وغیرہ کہنا کلماتِ کفر ہیں، توحید وجودی کی منزلوں کے طے کرنے میں جہاں انھوں نے نور، ادراک، تجلی، وصل، توبہ، صدق ایمان، مجاہدۂ نفس و ریاضت، ترک دنیا، ظاہری اور باطنی اخلاق پر بحثیں کی ہیں، وہاں انھوں نے تقویٰ پر بھی زور دیا ہے، جس سے مراد ان تمام چیزوں سے پرہیز ہے، جن سے دین یعنی اسلام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، یہ نقصان حرام چیزوں اور معصیت کی طرف مائل ہونے یا حلال چیزوں کی طرف زیادتی کے ساتھ رغبت رکھنے سے ہوتا ہے (مکتوبات سہ صدی ص ۲۴۴)۔ اسی کے ساتھ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اس پر زور دیا ہے کہ ایک سالک کے اعمال کی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ وہ نماز پڑھے، اگر نماز سے ملول ہوجائے تو تلاوت کلام پاک کرے، اور اگر اس سے بھی ملول ہوجائے تو ذکر کرے، اور اگر اس سے بھی ملول ہوجائے تو فکر کرے (مکتوبات سہ صدی ص ۶۶ - ۶۲) اسی لیے وہ اتباع شریعت محمدی پر زور دیتے رہے، خواہ ایک عارف وحدت الوجود کی تمام منزلیں طے کر چکا ہو، لیکن اگر وہ شریعت محمدی کا متبع نہیں ہے تو اس کی معرفت پر لعنت بھیجی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تعلیمات کے بعد ان کا وحدت الوجود اس وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہوجاتا ہے جس کے پیرو لا الٰہ الا اللہ کے تو قائل ہیں لیکن محمد رسول اللہ کے معترف نہیں، اور وہ یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ شریعت حقیقت کا چھلکا ہے اور حقیقت شریعت کا مغز ہے، اور جب حقیقت حاصل ہوجائے تو

شریعت کی ضرورت باقی نہیں، اس کے بعد وہ عذاب و ثواب کے بھی منکر ہوجاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وحدت سے نکل کر کثرت میں اور پھر کثرت سے وحدت میں گم ہوجائیں گے تو عذاب و ثواب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا، اسی افراتفری میں وہ حسین جمیل صورتوں کو پسند کرتے اور کہتے کہ حسن و جمال حضرت واجب الوجود سے مستعار ہیں، اسی لیے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کا رنگ دیکھتے، حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے، وحدت الوجود کے ایسے علمبرداروں پر حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے علاوہ تمام بزرگانِ دین نے لعنت بھیجی ہے،

ویدانت اور بھگتی تحریک کے محرکوں کے یہاں وحدت الوجود کا تخیل ضرور پایا جاتا ہے، اور کسی کو انکار نہیں کہ ان کے فلسفہ میں بھی بڑی دل آویزی ہے، لیکن اسلامی تصوف اور بھگتی تحریک کے وحدت الوجود میں وہی فرق ہے جو دو مذہبوں میں ہوتا ہے، اگرچہ دو مذہبوں کی بہت سی چیزوں میں بڑی خارجی مماثلت ہوتی ہے، لیکن دونوں کی داخلی وحدت میں بعد المشرقین ہوتا ہے، بھگتی تحریک اور صوفیۂ کرام کے وحدت الوجود میں مماثلت پیدا کرنے کے بعد ہی دونوں کی خوبیاں ظاہر نہیں کیجا سکتی ہیں، دونوں کے جلوے علیحدہ علیحدہ دکھائے جائیں تو یہ زیادہ مفید اور بامقصد خدمت ہوگی،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ اور پھر آخری دور میں حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ اور شاہ عبد الرحمٰن لکھنوی سب ہی وحدت الوجود کے قائل رہے، لیکن ان میں کسی نے بھی دامن شریعت نہیں چھوڑا، ان تمام بزرگوں نے اس پر زور دیا ہے کہ خواہ سالک ہو یا عارف، اگر عقائد اور اعمال میں کتاب و سنت کا پابند نہیں تو وہ قابل تقلید نہیں، اور جن صوفیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، اور سلف صالحین کے سرچشمے سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے، ان کی تقلید ہرگز نہ کیجائے، ان ہی بزرگان دین کی تعلیمات اور مسلمانوں کے راسخ عقائد کو

سامنے رکھ کر اقبال نے کہا ہے،

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

وحدت الوجود میں شریعت محمدی نہیں تو وہ سراسر بولہبی ہے، اس لیے اگر بولہبی کو کوئی شخص علمی اور تحقیقاتی استدلال سے اسلامی عقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرے تو یہ محض ایک شورش بے مدعا ہے، جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں:

گر باستدلال کار دیں بدے فخر رازی راز دار دیں بدے

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی مذکورۂ بالا تعلیمات کے بعد پروفیسر حبیب نے مصنف کی طرح ان کو ملا شاہ کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، (ص ۵، ۳-۱۳) جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں نے نہ ملا شاہ کا مطالعہ کیا ہے اور نہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا۔ ملا شاہ کی شہرت زیادہ تر اس لیے ہوئی کہ وہ دارا شکوہ کے مرشد تھے، اور وہ ان بزرگوں میں تھے جن کو دارا شکوہ باری تعالےٰ کہا کرتا تھا، اور اس پر وہ اعتراض نہ کرتے، کیونکہ وہ قصبہ باری کے رہنے والے تھے، وہ اپنے مریدوں کو دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، اور ان سے کہتے کہ تم دارا کی طرف متوجہ نہ ہوگے تو خدا سے پھر جاؤگے۔ (حسنات العارفین ص ۴۲) اس قسم کے خیالات حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے یہاں نہ ملیں گے۔

پھر مصنف نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ یقینی ان کی نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ابن العربی کے وحدت الوجود کو مقبول بنانے میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی کوششوں سے دور رس نتائج پیدا ہوئے (ص ۹۴) ان نتائج کی تفصیل مصنف کے ذریعہ سے معلوم ہوتی تو یقین ہوتا کہ مصنف نے ابن العربی اور حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے توحید وجودی کے سارے خیالات اپنے ہیں، جو مصنف کے گمراہ کن وحدت الوجود

کے تخیل سے بالکل مختلف ہیں، جن کے ماتحت انھوں نے اس مسئلہ کو سمجھ کر اپنے ناظرین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر حبیب نے مصنف کو یہ سند دی ہے کہ ان کے ایسا محقق ازمنۂ وسطی اور موجودہ دور میں نہیں پیدا ہوا، لیکن اس محقق کی تحقیق کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شرف الدین یحییٰ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت کرنے کے لیے دہلی پہنچے، تو اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات ہو چکی تھی (ص ۹۴) مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے دنیا کے تمام کتب خانوں کی خاک چھانی ہے، مگر ان کی رسائی حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے حالات میں سب سے مستند اور قدیم ترین تذکرہ مناقب الاصفیا تک نہ ہو سکی، جو ان کے مرید حضرت شیخ محمد شعیبؒ نے لکھا ہے اور چھپ چکا ہے، اس تذکرہ میں ہے کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی ملاقات حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ہوئی، لیکن انھوں نے یہ کہکر ان کو رخصت کیا، "سیمرغیست، نصیب دام ما نیست" (ص ۱۳۲) دونوں کی ملاقات کا ذکر لطائف اشرفی مطبوعہ نصرت المطابع دہلی (ص ۳۷۰) میں بھی ہے۔

مصنف کا بیان ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے نزدیک شرعی قوانین میں لچک ہے، جن پر عمل کرتے وقت مسلمانوں کی سہولتوں کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے، اور جب تک نص قرآنی کے خلاف کوئی بات نہ ہو معاصر مسلمانوں کے مسائل کی تعبیر عملی نقطۂ نظر سے ہونی چاہیے، مسلمانوں میں جو عام باتیں رائج ہو گئی تھیں، ان پر ان کی ہمدردانہ نظر تھی، اور انھوں نے ان کی مذمت محض اس لیے نہیں کی کہ گذشتہ عہد میں ان کو جائز نہیں سمجھا گیا، انھوں نے اپنے مریدوں کو ان باتوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی جن کو وہ پسند نہ کرتے ہوں، لیکن دوسروں کو ان کے ترک کرنے پر مجبور کرنے سے روکا، وہ ان تمام حدیثوں کو تسلیم نہیں کرتے جو پیغمبر سے منسوب ہیں، وہ مسلمانوں کی عام فلاح کو نماز اور روزے پر ترجیح دیتے ہیں، انھوں نے جوگیوں کی اہمیت اور کارناموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، مصنف نے ان تمام بیانات کے لیے معدن المعانی کے ایک قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے،

جو ان کو بوڈلین لائبریری سے حاصل ہوا تھا، حالانکہ معدن المعانی کا نسخہ ۱۸۸۴ء میں مطبع شرف الاخبار بہار میں چھپ گیا تھا، اور اب بھی مختلف کتب خانوں میں مل جاتا ہے، مگر تحقیقات عالیہ کے ایسے بلند بانگ دعووں کے باوجود ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی اور ایک ایسے قلمی نسخہ کا حوالہ دیا جس کی تصدیق کرنا ان کے ناظرین کے بس میں نہیں ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات بھی چھپ گئے ہیں لیکن مصنف نے ان مکتوبات کے قلمی نسخوں ہی کی آڑ میں پناہ لی ہے، تاکہ وہ جو کچھ لکھ جائیں اس کی تحقیق نہ ہو سکے، قلمی نسخوں کی آڑ لینے میں ہر جگہ ان کی یہی مصلحت کارفرما ہے، معدن المعانی کا جو مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس کے مطالعہ سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا وہی مطلب ہے جو مصنف نے اپنی غرض کے لیے نکالا ہے، اور پھر جس سیاق و سباق میں یہ چیزیں لکھی گئی ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، پھر اسی کتاب کے آغاز میں ایمان اور اسلام، شرک اور کفر کی جو تفصیل ملتی ہے اس کو بھی قلمبند کرنا چاہیے تھا، لیکن مصنف تو ایسے ہی صوفیہ کے قائل ہیں، جن کی نظروں میں ایمان و کفر، دوزخ و جنت اور عذاب و ثواب کی تفریق نعوذ باللہ ایک بیہودہ چیز ہے (دیکھو پیش لفظ ص ۱) لیکن حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے کفر، شرک، بے دینی، زندقہ، الحاد اور شطحیات کا جو معیار اپنی تصانیف، مکتوبات اور ملفوظات میں قائم کیا ہے، اگر مصنف نے اس کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو شاید ان کی عقیدت حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے باقی نہ رہتی، اگر وہ واقعی حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے معترف ہیں تو ان کو ان کی تعلیمات کا سچے دل سے مطالعہ کرنا چاہیے، اس کے بعد یقین ہو کہ وہ اپنی بے مثال کتاب کو نذر آتش کر دینے پر مجبور ہوں گے، لیکن اگر وہ برا نہ مانیں تو ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ چاہے جتنی بھی کوشش کریں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے تمام مکتوبات، ملفوظات اور تصانیف کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، اور پھر حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ ہی پر کیا منحصر ہے، بزرگان دین، صوفیائے کرام اور صلحا کو سمجھنے کے لیے جس تہذیب علم اور تہذیب نفس کی ضرورت ہے، اس سے وہ

محروم ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت ایسے بر خود غلط اور حرف گیر مستشرق کی ہے جو اپنے علم کی بے بضاعتی کے باوجود تصوف کی نبض رنگ و بو کو محض اپنے قلم کی نوک سے چھونے یا شریعت، طریقت اور حقیقت کی نکہت کو چکھنے یا صوفیائے کرام کے جلوۂ صد رنگ اور ان کے اسرار درخشاں کی تاک جھانک، کرنے یا معرفت الٰہی کے بحر زخار کو اپنے علم کے قطرے میں سمونے کی کوشش کرتا ہے،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات، ملفوظات اور تصانیف کی فہرست بڑی لمبی ہے، مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی، مکتوبات ہشت بہشت، معدن المعانی، مخ المعانی، راحت القلوب، خوان پر نعمت، کنز المعانی، معز المعانی، گنج لایفنی، مونس المریدین، تحفۂ عقبیٰ، ملفوظ الصغر، برات المحققین، فوائد رکنی، شرح آداب المریدین، عقائد اشرفی، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین، اجوبہ، اوراد خورد، اوراد اوسط، فوائد المریدین، رسالہ اشارات، رسالہ مکیہ اور اوراد کلاں وغیرہ،

مصنف کو ان کتابوں کی خبر بھی نہیں، اگر ہوتی تو وہ اپنی کتابیات کی فہرست کو اور بھی طویل بناتے، ان کتابوں میں دین و شریعت کے تمام مسائل آگئے ہیں، اس لحاظ سے یہ اسلام کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہیں، جن کے مطالعہ سے علما، صلحا، اور صوفیائے کرام نے اپنی زندگی سنواری ہے، اور آج بھی یہ اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہیں، جو مصنف کی من گھڑت اسلامی تعلیمات سے بالکل مختلف ہیں، خود مصنف نے لکھا ہے، کہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ اگر کسی صوفی میں نفس کا شائبہ بال برابر بھی رہ جائے تو یہ اس کے لیے کفر اور شرک ہے (ص ۵۱-۵۰)

مصنف صوفی تو نہیں ہیں، اور نہ مزاجاً کبھی ہو سکتے ہیں، لیکن وہ اگر واقعی حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے معترف ہیں تو وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کی تصنیف میں ان کی نفسانیت زیادہ کام کر رہی ہے یا وہ واقعی ایک مخلص محقق ہیں، وہ بظاہر صلح کل (Peace with all) کے قائل ہیں، چنانچہ اپنی کتاب میں اس پر عمل کرنے والوں کی بڑی حمایت کی ہے، لیکن وہ خود فیصلہ کریں کہ جن بزرگان دین کا مسلمان احترام

کرتے ہیں، ان پر خشیش زنی کرنی یا ان کی دل آزار تصویر کشی کہاں تک اس مسلک کے مطابق ہے، اگر اس سے وہ کسی خاص حلقہ میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کوئی شکایت نہیں، لیکن اس مقصد کے لیے وہ اپنی گمراہ کن تحقیقات کی آڑ لیکر صوفیہ اور صلحاء کو اپنا "تختۂ مشق" نہ بنائیں۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ذکر کے سلسلہ میں مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کے مشائخ بلکہ ہر زمانہ کے صوفیائے کرام کی مذمت کرتے رہے (ص ۵۲) حالانکہ وہ ان بزرگان دین میں تھے جو ۔۔۔۔ اپنی ہستی کو فنا کرکے اپنے تمام معاصر مشائخ کو اپنے سے بلند اور بہتر تصور فرماتے تھے، ایک بار حضرت سید جلال الدین بخاریؒ کی خدمت میں ایک کفش بھیجی جس سے یہ مطلب تھا کہ میں آپ کا کفش پا ہوں (مونس القلوب ومناقب الاصفیا ص ۱۴۱) ایک بار ان کی مجلس میں قاضی زاہد نے پوچھا کہ آپ مردان خدا کی جو صفت بیان فرماتے ہیں، اس کے مطابق ہندوستان میں کوئی مرد خدا ہے یا نہیں، فرمایا وہ مرد خدا پانی پت کا دیوانہ ہے، اس سے مراد حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ تھے، قاضی زاہد نے عرض کیا کہ ہندوستان میں بہت سے بزرگان دین ہیں، پھر آپ نے حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ ہی کو کیوں مخصوص فرمایا، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے فرمایا، تم نے مردان خدا کے بارہ میں سوال کیا تھا، نہ کہ بزرگان دین کے متعلق (مناقب الاصفیا، ص ۱۳۷) وہ تو حلاج، شیخ عز کاکوی اور احمد بہاری کے بھی معترف تھے، جو عالم جذب میں ایسی باتیں کہہ دیا کرتے تھے جن کو علماء ناپسند کرتے تھے، لیکن وہ ان کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کرتے تھے اور ان کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا حامل سمجھتے، اور ان کے بارہ میں علماء کے فتوی پر ان کو دکھ ہوا (مناقب الاصفیا ص ۱۳۸-۱۳۷) اور اس دکھ کو سمجھنے کے لیے چشم بینا اور قلب روشن کی ضرورت ہے۔

مصنف اگر حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے "مصلحۃً" نہیں بلکہ "واقعۃً" معترف ہوتے تو وہ حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت پر حرف گیری نہ کرتے، مصنف کو جہاں ان کی اور باتوں سے

پہنچی ہے وہاں اس کا بھی دکھ ہے کہ انھوں نے شریعت کی تجدید کا نعرہ بلند کیا (ص ۵۶) اور ایسے مسلمانوں کو دینی لحاظ سے پسند نہ کرتے تھے جو بھکتی تحریک سے متاثر ہو کر خدا کو ٹھاکر، دھنی اور کرتار کہتے (ص ۵۷)

اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنے کو حضرت جلال الدین بخاریؒ کا کفش بردار کہنے میں تامل نہ کرتے تھے، اور خود حضرت جلال الدین بخاری ان کو اپنا سرتاج مانتے، اور وہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کو یاد کرکے اپنا سینہ ملتے اور فرماتے "بوئے عشق از طرف بہار می آید" اور ان کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے وقت کسی سے نہیں ملتے (مونس القلوب قلمی ومناقب الاصفیا ص ۱۴۱، ۱۴۰) لیکن ہمارے مصنف کو کسی کی عظمت کی کیا پروا، ان کا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے ناوک قلم سے کوئی صید چھوٹنے نہ پائے،

اس باب میں شطاریہ سلسلہ کا بھی ذکر خیر ہے، ان کے بزرگوں کا اصلی کارنامہ مصنف کی نظر میں یہ ہے کہ انھوں نے وحدت الوجود میں غرق ہو کر یوگ اور ادویتا ویدانت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا، شیخ محمد غوث نے امرت کنڈ کا ترجمہ فارسی میں بحر الحیات کے نام سے کیا، اور ان کے مرید منجھن نے مادھو مالتی لکھی،

آخر میں اس باب کا خلاصہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ

"راسخ العقیدہ علماء اور صوفیہ نے شریعت کی تجدید کے نعرے ضرور لگائے لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی جب تک کہ شریعت کی تعبیر فیاضانہ طور پر نہ کی جاتی (ص ۶۶)

اس کے بعد مصنف نے بڑے انشراح کے ساتھ لکھا ہے کہ

"بھکتی تحریک نے ثقافتی اور معاشرتی اتحاد کے ارتقا کو بڑی مدد پہنچائی، شہودیوں اور ایسے تمام رجعت پسند عناصر کی کوششوں کی نفی کر دی، جو فرقہ وارانہ جذبات ابھار رہے تھے۔" (ص ۶۷-۶۶)

مصنف کے نزدیک رجعت پسند عناصر سے مراد وہ بزرگان دین ہیں جو راسخ العقیدہ اور شریعت کے علمبردار تھے۔

مصنف نے جا بجا بھگتی تحریک سے متعلق اظہار عقیدت کیا ہے، اگر وہ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرکے اپنی ذات سے ناظرین کو متاثر کرنے کی کوشش نہ بھی کرتے تو بھگتی تحریک کی پسندیدگی کوئی ناپسندیدہ بات نہیں، وہ اپنی جگہ پر بڑی ہی دل آویز اور دلکش تحریک ہے، لیکن اسلام کے علما، صلحا اور صوفیہ پر بنیش نزئی کرکے انکی دل آویزی اور دلکشی ثابت کرنا اس تحریک کے مطالعہ سے تمدد پیدا کرنا ہے، جو انکی خدمت کے بجائے انکی مخالفت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مصنف کے اس پورے باب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تصوف کا کوئی ذاتی مطالعہ نہیں کیا ہے، بلکہ چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ اور شطاریہ سلسلوں پر جو تحقیقات ہو چکی ہیں انکو سامنے رکھکر اپنے مطلب کی باتیں لے لی ہیں، جو اگر سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیجاتیں تو ہرگز وہ مطلب نکلتا جس کو مصنف نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مصنف کو حوالے دینے میں بڑی مہارت اور استادی کا درجہ حاصل ہے، وہ ثانوی ماخذوں کو پڑھکر اصلی ماخذوں کے حوالے دینے میں بڑے کامل ہیں، اس طرح انکے ۲۲۴ صفحے کے مقالہ میں نصف سے کچھ ہی کم حصہ ان حوالوں اور حواشی کے نذر ہو گیا ہے، ان حوالوں میں جو فریب کاریاں ہیں، ان کی خبر ان کے ممتحنوں کو تو نہیں ہو سکی لیکن ان کا تجزیہ کرنے کے بعد اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مصنف نے حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ

"ان میں گہری انسانیت نوازی بہت زیادہ تھی، انھوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات مشرقی یو۔پی۔ بہار، راجپوتانہ اور پنجاب میں مدت تک قیام کیا، جس سے بہت سے جوگیوں سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے، وہ برابر ان کے جماعت خانہ میں آیا کرتے تھے (ص ۱۸-۱۷)

معلوم نہیں مصنف کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے مشرقی یو۔پی اور بہار میں جاکر قیام کیا، اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

مصنف ص ۱۰۱ پر حضرت شیخ حمید الدین صوفی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"ان کے کھانے پینے کے عادات ہندو جوگیوں کی طرح تھے، انھوں نے اپنے کو صرف سبزی کھانے تک محدود رکھا، ہندی یا ہندوی ان کے خاندان کی بولی تھی، ان کی وفات ۲۹ ربیع الثانی ۶۷۳ھ (مطابق نومبر ۱۲۷۴ء) میں ہوئی"

مصنف نے اس کے لیے سیر الاولیاء ص ۱۶۵، ۱۵۶، سیر العارفین ص ۱۳-۱۴، اخبار الاخیار ص ۳۰، ۲۹ اور گلزار ابرار ورق ۳۵ کے حوالے دیے ہیں، جو بظاہر اس لیے ہیں کہ ناظرین کو حضرت حمید الدین صوفی کے ہندو جوگیوں کی طرح کھانے پینے کے عادات اور ان کے خاندان والوں کی بولی کی سند معلوم ہو جائے، دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر اس کی سند سیر الاولیا یا سیر العارفین یا اخبار الاخیار یا گلزار ابرار میں ملتی ہے تو ان کتابوں کے ان ہی صفحوں کا حوالہ ہونا چاہئے تھا، جہاں سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں، لیکن حوالے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ تمام حوالے اس لیے ہیں کہ ان کتابوں کے ان صفحات میں حضرت حمید الدین صوفی کے حالات ملیں گے جن میں ان کے ہندو جوگیوں کی طرح سبزی خور ہونے کا ذکر آجاتا تو غنیمت تھا لیکن سیر الاولیاء، سیر العارفین، اخبار الاخیار اور گلزار ابرار میں کہیں یہ ذکر نہیں، گو صوفیۂ کرام کے یہاں سبزی کھانا عام بات تھی، اس کو ظاہر کرنا کوئی تحقیق نہیں، زیادہ تر صوفیہ تو صرف ابالی کھچڑی ہی پر اکتفا کرتے، حضرت فریدالدین گنج شکر زنبیل کی روٹی پسند فرماتے تھے، ان کے یہاں اکثر ویلہ پکا کرتا تھا، جو ایک قسم کا جنگلی پھل تھا، اسی طرح حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ایک روٹی سبزی یا تلخ کریلہ کے ساتھ تناول فرماتے۔

حضرت حمید الدین ہی کے ذکر میں مصنف لکھتے ہیں کہ

"انھوں نے ناگور میں سکونت اختیار کر لی تھی، جہاں ایک کاشتکار کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کا بیشتر اوقات میں ایسے ہندوؤں سے نزدیکی تعلق پیدا ہوا، جن کو وراثت میں جوگیوں کی روایات ملی تھیں، اور جنھوں نے ریاضت، تیاگ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی تھی،

ایک ہندو کے بارہ میں وہ متواتر کہتے رہتے کہ وہ ولی ہے۔" (ص ۱۷)

اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا فوائد الفواد کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن جس سیاق وسباق کے ساتھ ہندو کو ولی کہا گیا ہے، اس کو مصنف نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے، یہ سیاق وسباق سیر الاولیاء اور سیر العارفین سے صاف ہو جاتا ہے، یہ دونوں تذکرے مصنف کے پیش نظر رہے ہیں، لیکن ان میں جو بات کہی گئی ہے اس کو حذف کر کے مصنف اپنے مطلب کی بات کہہ گئے ہیں، سیر الاولیاء (ص ۱۵۸) میں ہے:

"ہندوئے بود، ناگاہ چوں در نظر مبارک شیخ حمید الدین بیامدے، شیخ فرمودے کہ این ولی خداست، و گفتے بوقت مردن او با ایمان خواہد رفت، و ختم کار او بخیر خواہد بود، و واقع هم بر آں جملہ شد کہ ایشان فرمودند، این نفس دلیل بر علو درجت و کرامت شیخ حمید الدین سوالی است۔"

سیر العارفین میں ہے:۔

"روایت ہے حضرت شیخ نظام الدین سے کہ نواحی اجمیر میں ایک ہندو رہتا تھا کہ شیخ حمید الدین اس کو دیکھ کر ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہندو ولی اللہ در خدا ہے، لوگ سنتے اور کہتے یہ تو کافر ہے، یہ کیسے ولی اللہ ہو جائے گا، شیخ حمید جواب دیتے کہ خدا کی عنایت سے کیا دور ہے، چنانچہ آخر کار وہ ہندو مسلمان ہوا اور ولی اللہ ہو گیا۔" (اردو ترجمہ ص ۱۳ فارسی نسخہ اس وقت سامنے نہیں ہے)

اب ناظرین مصنف کے بیان اور تذکرہ نگاروں کی تحریروں کو پڑھ کر خود اندازہ لگائیں کہ مصنف نے کس طرح ایک چیز کو مسخ کر کے پیش کیا ہے، تذکرہ نگاروں نے کیا لکھا ہے، اور مصنف نے کیا لکھ ڈالا ہے۔

وہ اپنے مطلب کی بات بنانے کے لیے واقعات کو حذف کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتے، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سامنے کہا گیا کہ ایک ہندو ہے جو کلمہ بھی پڑھتا ہے، خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر یقین بھی رکھتا ہے لیکن جب مسلمان اس کے سامنے آتے ہیں تو وہ ساکت رہتا ہے، اس کی عاقبت کیسی ہوگی؟ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے جواب دیا، اس کا معاملہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہے، خداوند تعالیٰ یا تو اس کو معاف کر دے یا عذاب نازل کرے، یہاں تک تو مصنف کا فوائد الفواد سے روایت کو نقل کرنا بالکل درست ہے (ص ۲۱) لیکن اسی کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ابو طالب سے متعلق جو باتیں کہی ہیں، ان سے جو ظاہر ہوتا ہے اس کو مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے نزدیک کفر اور گمراہی کا جو معیار تھا اسکو مصنف ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اسی طرح مصنف نے لکھا ہے کہ ایک غلام جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مرید تھا، ایک ہندو کے ساتھ آیا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور جب دونوں بیٹھ گئے تو حضرت خواجہ نے غلام سے پوچھا کہ تمہارا بھائی اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے، جواب دیا کہ میں آپ کی خدمت میں اس کو اس لیے لایا ہوں کہ آپ کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے، خواجہ نے اشکبار ہو کر کہا کہ اس قوم سے جتنا بھی کہا جائے اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا ہے، اگر اس کی صحبت کسی صالح بزرگ کے ساتھ ہو جائے تو وہ مسلمان ہو جائے (ص ۲۱) یہاں تک تو مصنف نے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہے، لیکن یکایک وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اس کے یہ معنی ہیں حضرت خواجہ نیکی، اخلاق کی بلندی، پرہیزگاری اور خداترسی پر زیادہ زور دیتے تھے، حضرت خواجہ نے نمناک آنکھوں کے ساتھ جو کچھ کہا، اس کا وہ مطلب نہیں جو مصنف نے ناظرین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی دو روایتیں بھی بیان کی ہیں، لکھتے ہیں کہ بادشاہ عراق حضرت عمرؓ کی صحبت سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا (ص ۲۱) یہ صحیح نہیں، حضرت عمرؓ نے بادشاہ کو ایک بزرگ کے حوالے کیا، اور وہ بزرگ کی صحبت سے متاثر ہو کر

اسلام لایا، فوائد الفواد کی عبارت یہ ہے :

"امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ از کیاست او (یعنی بادشاہ عراق) متعجب ماند، فرمود کہ ان دام بعد ازاں او را مصاحبت یاری فرمود کہ آں یار در غایت صلاحیت و زہادت بود، چوں بادشاہ عراق بار در خانۂ آں یار بردند، و با او چند گاہ برآمد، صلاحیت صحبت آں یار در و اثر کرد و جانب عمر پیغام فرستاد کہ مرا پیش خود طلب تا ایمان آرم، عمر او را پیش طلبید و اسلام عرض کرد، مسلمان شد۔ (فوائد الفواد ص ۱۸۳)

اس سے یہ مراد ہے کہ تبلیغ کے لیے بزرگوں کی صحبت بڑی کارگر ہوتی ہے، حضرت خواجہ کا کچھ اور مقصد ہے، اور ہمارے مصنف کا طنبورہ کچھ اور کہتا ہے، مصنف کی دلیل سے اختلاف نہیں، لیکن صرف دکھانا یہ مقصود ہے کہ تحقیقات کا یہ ہیرو واقعات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے،

مصنف کہتے ہیں :

Sufistic poetry reached quarters where otherwise it would not have reached

انگریزی کے ان فقروں کے ذریعہ سے وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس کے نیچے حوالہ ہے Itabies, Diwans Diwans of Amir Khusru میں ہے (ص ۲) خیال ہوتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی کوئی تصنیف ہوگی، لیکن Diwans امیر خسرو کی کوئی تصنیف نہیں، ان کے دواوین میں تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، نہایۃ الکمال، غرۃ الکمال وغیرہ کا ذکر تو آتا ہے، لیکن Diwans کا کہیں ذکر نہیں آیا۔

حوالے کی فریب دہی کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو، خیر المجالس میں ہے :

"بعد ازاں گیاہ کہ قلندراں می خورند از نہاں بکشید و در کچکول خمیر کردن گرفت (ص ۱۳۰)

اس کو سامنے رکھ کر مصنف لکھتے ہیں کہ

Some of them ate a type of grass which is not specified in sources but was apparently hemp. They were generally very temperamental and miracle-mongers (4)

اس کے عددی نشان کے نیچے خیر المجالس ص ۱۳۰ کا حوالہ ہے، مصنف نے Hemp کا لفظ اپنی طرف سے بڑھانے کے بعد عددی نشان جن الفاظ پر دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خیر المجالس میں miracle, mongers, Temperamental کے مرادف فارسی یہ الفاظ ملیں گے لیکن یہ الفاظ مصنف کے ہیں،

مصنف کی کتاب کے صرف ایک باب پر اتنی لمبی تنقید لکھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، ابھی نو ابواب اور ہیں اور ہر باب اتنی ہی لمبی تنقید کا محتاج ہے، ان کو قلمبند کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک پوری کتاب تیار ہو جائے، جو ظاہر ہے کہ کوئی خوشگوار تصنیف نہ ہوگی، مگر مصنف نے اپنے بہکے ہوئے شعور، بھٹکے ہوئے ذہن اور گمراہ کن تحقیقات سے تصوف اور مذہبی تحریکات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس کی طرف ذہن منتقل کرانا بھی ضروری ہے، تاکہ مصنف کا کذب و افترا، حق و صداقت نہ سمجھا جائے، اس کتاب کو ڈی، لٹ کا ایک مقالہ سمجھ کر نظرانداز کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اب پی، ایچ، ڈی اور ڈی، لٹ کے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں، ان کا معیار روز بروز گرتا چلا جا رہا ہے، لیکن پروفیسر حبیب نے اس پر جو پیش لفظ لکھا ہے، اس سے کتاب کے مطالعہ کی نوعیت کچھ بدل گئی ہے، اور پیش لفظ مصنف کے لیے بلائے جان ہے۔

پروفیسر حبیب لکھتے ہیں :-

ایسے بہادر اونچے درجہ کے لوگ ہوئے ہیں جن کے سامنے وسیع انسانیت رہی ہے، اور وہ مذہبی تعصبات سے آزاد رہے ہیں، مثلاً البیرونی، بوعلی سینا، ابن رشد، ابن العربی، شیخ نظام الدین اولیا، داراشکوہ وغیرہ جن کے بارے میں ڈاکٹر اے، اے رضوی بہت صحیح لکھتے ہیں کہ "انکی نگاہوں میں مومن و کافر، جنت اور دوزخ، ثواب اور عذاب کی تفریق بیہودہ چیز تھی"۔ ڈاکٹر اے اے رضوی ہماری نسل میں اس جماعت کے عظیم ترین فرد دکھائی دیتے ہیں"۔ (پیش لفظ ص)

پروفیسر حبیب مصنف کو جتنا بھی اونچا درجہ دینا چاہیں دیں، کوئی شکایت نہیں، لیکن اوپر کی سطروں میں جن بزرگوں کے اسماء ان کی نوک قلم سے ایک ساتھ نکل گئے ہیں، ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علی صحو کے بجائے تحقیقاتی سکر کی حالت میں لکھ گئے ہیں، انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا ضرور مطالعہ کیا ہے، لیکن اس مطالعہ کے بعد ان کو داراشکوہ کی صف میں لاکر کھڑا کرنا تعجب انگیز ہے، اس قسم کی تحریریں لکھکر کسی مجمع کے حاضرین سے تو تالیوں کی گونج میں خراج تحسین ضرور حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن جو تحقیقات کا مرد میدان ہونے کا دعوی کرتا ہے وہ ایسی مضحک بات نہیں لکھ سکتا ہے، پروفیسر صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒء کے مجموعۂ ملفوظات فوائد الفواد کو ایک مستند کتاب سمجھتے ہیں، اس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی زبانی کفر و ایمان، عذاب و ثواب کی تصریح بہت ہی واضح طور پر ملے گی، مثلاً

"معتزلہ کے قول کی بات آگئی جس کا مطلب یہ تھا کہ حکم ہے کہ اہل کفر اور اہل کبائر (کبیرہ گناہ کرنے والے) ہمیشہ عذاب میں ہوں گے، فرمایا یہ غلط ہے، مذہب یہ کہتا ہے کہ کافر ہمیشہ عذاب میں ہوں گے، سبب اس کا یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ جس کی وہ پرستش کرتے ہیں وہ ان کا معبود ہے، اور ان کا یہ عقیدہ ہمیشہ رہتا ہے، اور چونکہ یہ اعتقاد کفر دائم ہے، اس لیے ان کا عذاب ہمیشہ رہے گا، اہل کبائر ہمیشہ کبائر میں مبتلا نہیں رہتے ہیں، جب وہ گناہ کے

ارتکاب سے فارغ ہو جاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کیا غلط تھا، حق نہ تھا، اس لیے ان کا اعتقاد ہمیشہ کے کبائر میں راسخ نہیں ہوتا ہے، اس لیے ان پر ہمیشہ عذاب نہ ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک گناہ گار، گناہ کی حالت میں تین صفتوں کے لحاظ سے مطیع ہوتا ہے، پہلا تو یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے حق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ حق تعالے جانتا ہے اور دیکھتا ہے، تیسرے یہ کہ وہ اپنی بخشایش کی امید رکھتا ہے، یہ تینوں عقیدے فرماں برداروں کے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ اشاعرہ کا مسلک یہ ہے کہ ایک کافر کا خاتمہ ایمان پر ہو تو وہ مومن ہے، اور ایک مومن کا خاتمہ نعوذ باللہ کفر پر ہو تو وہ کافر ہے، اور اسی معنے میں ایک حکایت بیان کی کہ خواجہ حمید سوالی رحمۃ اللہ علیہ ناگور میں ایک ہندو کو کئی بار کہا کہ یہ ولی ہے"۔ (فوائد الفواد ص ۷۰-۶۹)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں :-

"کفر ست و بدعت و معصیت است، بدعت از معصیت بالاتر است و کفر از بدعت بالاتر، بدعت بکفر نزدیک است (ص ۱۰۹)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے عقیدہ میں اتنی شدت تھی کہ وہ حضرت علیؓ کے والد بزرگوار، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق اور محبوب چچا ابو طالب کے متعلق بھی واضح طور پر فرماتے ہیں کہ ان کی وفات کفر پر ہوئی، فوائد الفواد میں ہے :

"ابو طالب کا ذکر آگیا تو فرمایا کہ جب وہ بیمار پڑے تو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم انکے نزدیک تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ ایک بار آپ خدا کی وحدانیت کا اقرار کر دیں، خواہ یہ اقرار زبان سے با صدق دل سے ہو، تاکہ میں خدا سے کہہ سکوں کہ اے اللہ! آپ پر وہ ایمان لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کچھ کہا، کوئی اثر نہ ہوا،

اور اسی طرح وہ کفر پر وفات پاگئے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے ان کے مرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے اس طرح کہا کہ آپ کے چچا گمراہ ہو کر مرے، رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو غسل دیں، کفن میں لپیٹیں، گو، یعنی گڑھا بغیر لحد کے کھودیں اور اوپر سے ان کو گور میں ڈال دیں، یعنی وضع کو راہ نہ دیا جائے (یعنی عام مسلمانوں کی طرح دفن نہ کیے جائیں) (ص ۱۳۵)

ان تصریحات کے بعد یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے نزدیک مومن اور کافر، جنت اور دوزخ، ثواب اور عذاب کی تفریق بیہودہ چیز تھی، اسی طرح یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ البیرونی، بوعلی سینا اور ابن عربی نے بھی اس قسم کی تفریق کے قائل نہ تھے، انکی کتابوں سے اقتباسات پیش کرنے میں خواہ مخواہ طوالت ہوگی، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کو جس غلط طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، اسی سے اندازہ ہوگا کہ تحقیقات کے بعض ہیرو پرستی تعریف حاصل کرنے کے لیے ایسی بات لکھنے میں مطلق تامل نہیں کرتے، جس کا تعلق حقیقت اور صداقت سے مطلق نہیں ہوتا،

کتاب کے آیندہ ابواب پر انشاء اللہ کسی اور موقع پر تبصرہ شائع ہوگا، لیکن ہر باب میں تحقیقات کی اتنی غلطیاں اور گمراہیاں ہیں کہ ان کی نشاندہی مشکل تو نہیں لیکن صبر آزما ضرور ہے، اس کتاب کے لکھنے کا مقصد عام مسلمانوں میں اشتعال پیدا کرنا ہے لیکن مصنف کی تخریبی کوشش ان کا مقصد پورا کرنے کے بجائے الٹا اثر پیدا کرے گی، انکی تحریر ان کی زبان حال سے کہہ رہی ہے

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

ہندی شاعری کا تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب ایم اے شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱۱)

لیکن مندرجۂ بالا شعرا میں جو مقبولیت میتھلی شرن گپت کو ملی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی، ہندی پریمیوں میں گپت جی بے حد عزیز تھے، انھوں نے بیشتر نظمیں قومی جذبات کو ابھارنے کیلئے لکھیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد سے وہ ملک کے قومی شاعر تسلیم کیے گئے، گپت جی ایک مذہبی انسان تھے، انھیں ہندوستانی تمدن کی عظمت اور برتری کا احساس تھا، وہ ہندوستان سے صرف اسلیے پیار نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کا وطن ہے بلکہ اسلیے بھی اسے عزیز رکھتے تھے کہ دیوتاؤں اور اوتاروں کے چرنوں کی دھول اس میں شامل ہے،

"ماتر بھوم" کے عنوان سے اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

جے جے بھارت بھوم بھوانی | امروں نے بھی تیری مہما وار وار بکھانی
تیرا چندن بدن وٹ وکٹ شانت سندر بھار سا تا ہے | ملیانل فنسو اس نرالا نو جیون سرسا تا ہے
ہرشے ہار کر دیتا ہے یہ انچل نیرا دھانی | جے جے بھارت بھوم بھوانی[1]

اور "بھارت ورش" کے عنوان سے اپنی ایک نظم میں نوا سنج ہیں ؎

ہرا بھرا یہ دیش بنا کر ودھ نے روی کا مکٹ دیا | پاکر پرتھم پرکاش جگت نے اس کا ہی انسرن کیا
پربھو نے سویم پنیہ بھو کہکر یہاں پورن اوتار لیا | دیوؤں نے رج سر پر رکھی دیتیوں کا ہل گیا ہیا
لیکھا سرشٹ اسے شسٹوں نے وشٹوں نے دیکھا دھر ش | ہر کا کرنیا چھیتر ہمارا بھوم بھاگ یہ سا بھارت ورش[2]

---

[1] گپت: سودیشی سنگیت ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۱

لیکن گپت جی محض ہندوستان کی عظمت کا راگ نہیں الاپتے، بلکہ انکی نگاہ اس ہندوستان پر بھی ہے جو اپنی سب اخلاقی اور سماجی قدریں کھو چکا ہے، وہ اپنے معبود کو مخاطب کرتے ہیں، اور دریافت کرتے ہیں کہ آخر وہ ہندوستان کیا ہوا جس کے لیے آپ کی عنایات مخصوص تھیں جہاں پر کوئی بھوکا اور کنگال نظر نہیں آتا تھا، جہاں دشمن سے عوام خوفزدہ نہیں رہتے تھے، انھیں انھی کے ذکر سے دل کو تقویت پہنچنے کے بجائے ٹھیس پہنچتی ہے،

سکھ سبھی جس کو تم نے دیے | دودھ، روپ دھرے جس کے لیے
نہ کچھ وستو البھیہ رہی جہاں | اب ہرے! وہ بھارت ہے کہاں؟
سن پڑی نہ کہیں چھل چھدرتا | کر سکی نہ پرویش دردرتا
ڈر کسی ریو کا نہ رہا جہاں | اب ہرے! وہ بھارت ہے کہاں؟
گن کہاں تک یوں اس کے کہیں | اُچت ہے اب تو چپ ہو رہیں
سکھ کتھا دکھدا ایک ہے یہاں | اب ہرے! وہ بھارت ہے کہاں؟[1]

آخر میں وہ اپنے معبود حقیقی سے منت کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مرتبہ پھر فتح حاصل ہو، اور ایک مرتبہ وہاں پھر عیش و سرور کی فضا قائم ہو سکے جو زمانۂ قدیم میں اس کا خاصہ تھی۔

نہ ہم کو کوئی بھی بھے ہو | دیا ہے بھارت کی جے ہو
اِستا پر تن کی جے ہو | چیلتا پر من کی جے ہو
کرنیتا پر دھن کی جے ہو | مرن پر جیون کی جے ہو
پو ترا تما کا پرتیہ ہو | دیا سے بھارت کی جے ہو[2]

وہ خود کو بھارت سے علیحدہ کچھ نہیں سمجھتے ان کی تمنا ہے کہ انکی ذات میں اتنی وسعت پیدا ہو جائے کہ وہ خود کو ہندوستان سمجھ سکیں، "انشچے" کے عنوان سے اپنی ایک نظم میں تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] گپت سودیش سنگیت ص ۵۵ [2] سودیش سنگیت ص ۹۶-۹۷

دھرتی ہل کر نیند بھگا دے | وجرنا دسے دیوم ہلا دے
دیوا دہ کچھ لاگ لگا دے | نشچے کروں کہ بھارت ہوں میں
ہوں یا تھا چنتا رت ہوں میں[1]

کروڑوں بھارتی عوام کے دلوں میں گپت جی یہ احساس پیدا کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ صدیوں سے خوابیدہ رہے ہیں، اب انھیں بیدار ہونا ہے، انھیں ملک و قوم کی اس عظمت کو دوبارہ زندہ کرنا ہے جو تمام دنیا میں ان کی سربلندی کا باعث تھی، عروج و زوال کی دوڑ میں عروج و ارتقا کے پرچم کو سنبھالنے کے لیے پھر وطن اور اس کے لاڈلوں کو آگے بڑھنا ہے۔

سب باتوں میں ہم سب سدا آگے ہیں | وگھنوں کے بھے سے کہیں نہیں بھاگے ہیں
صدیوں تک سوئے کنتو پنہ جاگے ہیں | اب بھی ہم نے نج بھاؤ نہیں تیاگے ہیں

پھر باری ہے سنسار ہماری آئی
ہم میں بھارت سنتان کروڑوں بھائی[2]

میتھلی شرن گپت اہل وطن کو بیدار کر دینا ہی اپنا فریضہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ انھیں بلند کردار انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، ہندوستان میں مختلف قوم و قبیلہ کے افراد بستے ہیں، اسلیے وہ ہر قوم و ہر قبیلہ کے ایسے آدرش انسانوں کو پیش کرتے ہیں جن کے کردار سے دنیا روشنی حاصل کر سکے، کبھی رام کا کردار پیش کرتے ہیں اور ساکیت جیسی اہم تصنیف وجود میں آتی ہے، کبھی کرشن کو مشعل راہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور "مہابھارت" کی روشن تاریخ دہراتے ہیں، کبھی بودھوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے یشودھرا کے کردار پیش کرتے ہیں، کبھی مسلمانوں کو مخاطب کرنے کے لیے "کعبہ اور کربلا" کی طرف توجہ دلاتے ہیں،

گپت جی موجودہ ہندوستان کے غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے مسلک کی نمایندگی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو بھی قابل احترام سمجھا، اور ان کے خصوصیات اور اوصاف کی جانب بھارتی عوام کو

---

[1] سودیش سنگیت ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۸۷

مائل کرنے کی کوشش کی، ان کے متعلق موہن سنگھ سینگر کا یہ قول بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ

"رام کے حقیقی معتقد ہونے کے ناتے وہ آدمی آدمی میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے، ان کے یہاں سبھی انسان یکساں طور پر عزت و احترام کے لائق تھے" (آجکل مئی ۱۹۶۵ء ص ۳۶)

گپت جی کی پیدائش ۳ اگست ۱۸۸۶ء کو چرگاؤں (جھانسی) میں ہوئی، انکے والد رام چرن جی ایک بیوپاری تھے، ابتدائی تعلیم قصبہ میں ہی ہوئی، چھٹی جماعت کے بعد اسکول کو خیرباد کہا۔ ابتدا میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا، اس لیے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے، لیکن وہاں بھی سکون میسر نہ ہوا، تو پھر پڑھائی کی طرف مائل ہوئے، گھر پر رہ کر مختلف زبانیں سیکھیں اور ان کے ادب کا مطالعہ کیا، ہندی عروض پر انھیں خاص مہارت حاصل تھی، اب کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، شروع میں منشی اجمیری سے اصلاح لیتے رہے، پھر جب انکی ملاقات مہاویر پرساد دویدی سے ہوئی تو وہ ان کی نظموں سے بیحد متاثر ہوئے، انھوں نے گپت جی کی کچھ نظمیں اصلاح کے بعد سرسوتی (ہندی ماہنامہ) میں شائع کیں، سرسوتی میں نظموں کی اشاعت سے گپت جی شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئے، گپت جی کلیۃً کھڑی بولی کے شاعر تھے، وہ اس کی طرف جس طرح مائل ہوئے اس کا سبب خود تحریر فرماتے ہیں:

"ان دنوں کھڑی بولی کا نیا نیا پرچار ہو رہا تھا، قدیم رسمی شاعری سے لوگ اوب اٹھے تھے، زمانے کی رفتار بدل گئی تھی، اور لوگوں کے خیالات بھی، مگر برج بھاشا کی مٹھاس کے سہارے کھڑی بولی کی نظموں کی مخالفت ہو رہی تھی، پھر بھی ایک جماعت نے اسے فوراً اپنا لیا، اس کے شائقین کی تعداد خواہ اس وقت اتنی بھی نہ ہو جتنی اب اس کے شاعروں کی ہے، مگر اسے نراش نہیں ہونا پڑا، نثر پر اس کا قابو تھا، نظم بھی اس کا انتظار ہی کر رہی تھی، وہ آسانی سے سمجھ میں بھی آجاتی تھی، نئی پیڑھی کے لوگ اس کے طرفدار بن گئے،

اگرچہ وہ شوگوئی ہی تھی مگر تھی وقت کی راگنی، میرے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی مگر اس میں میری کارگذاری کم اور میرے وقت کی زیادہ تھی، جگ کی سرسوتی (ماہنامہ) میرے موافق تھی، اور جگ کے آچاریہ (مہاویر پرشاد دویدی) نے لطف و کرم کے ساتھ مجھکو اپنا لیا تھا" (بحوالہ اردو سہ ماہی جنوری ۱۹۴۲ء ص ۵۵)

گپت جی کی قومی نظموں میں "بھارت بھارتی" بے حد مقبول ہوئی، اس تصنیف میں مسدس حالی کی طرز پر ہندوستانیوں کے ماضی اور حال کی مصیبتوں کی روشنی میں مستقبل کا تعین کیا گیا تھا، ملک کے خوابیدہ عوام کو جھنجھوڑ کر عظمت ماضی کی یاد دلائی گئی اور مستقبل کو حسین اور شاندار بنانے کی دعوت دی گئی تھی، اس طرح شمالی ہندوستان میں قومی بیداری پیدا کرنے میں گپت جی کی اس نظم نے جو رول ادا کیا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے، ان کے سودیش سنگیت اور جے بھارت میں بھی اسی طرح کے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کی گئی ہے، ان نظموں کے اقتباسات درج کیے جا چکے ہیں،

گپت جی تلسی داس کی طرح رام کے بھگت ضرور تھے، لیکن رام پر انکا اعتقاد کسی مذہب یا فرقے کی بنا پر نہ تھا، بلکہ انصاف، سچائی اور تہذیبی عظمت کی روشنی میں انھوں نے رام کے چرنوں میں سر نیاز خم کیا تھا، ان کے نزدیک رام کا مکمل کردار شاعری ہے، اس لیے ان کے کردار کی ترجمانی کرنے والے کا شاعر بنجانا بالکل فطری ہے،

رام تمھارا چرت سویم ہی کاویہ ہے — کوئی کوی بنجائے سہج سمبھاویہ ہے

ساکیت میں گپت جی کے حساس دل نے ان کرداروں کی طرف بھی پوری توجہ کی ہے جنھیں تلسی داس نے یا تو نظرانداز کر دیا ہے، یا نہایت حقیر نگاہوں سے دیکھا ہے، ارملا اور مانڈوی کو ایک آدرش کردار کے روپ میں پیش کرنے کا سہرا گپت جی کے سر ہے، کیکئی کے ساتھ انصاف اور اسے ایک آدرش ماں اور عورت کے روپ میں پیش کر کے گپت جی نے اپنی

بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے، اسی طرح اپنی تصنیف یشودھرا میں بھی عورت کی عظمت کا ایک کامیاب خاکہ پیش کیا ہے، عورت کی زندگی کے بارے میں گپت جی کا یہ شعر ہندی حلقہ میں بیحد مقبول ہوا،

ابلا جیون ہائے تمھاری یہی کہانی　　　آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی

اس شعر میں ہندوستان کی اس نمایندہ عورت کا پورا نقشہ آگیا ہے جو سسکیاں بھرتی ہوئی پیدا ہوتی ہے، اور اسی طرح سنسار سے اٹھ جاتی ہے، گپت جی کی ذیتا لک، کنال، پرتھوی پتر، سدھ راج، پنچ وٹی، ہندو، گورو کل، انگھ، کسان اور جھنکار وغیرہ ان کے آدرشوں کے تراشے ہوئے خوبصورت اور جاذب نظر مجسمے پیش کرنے میں ان کی بیحد کامیاب نظمیں ہیں۔

ان تصانیف کی روشنی میں شاعر کی عظمت اور ہندی ادب میں اس کے مقام کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے سماجی نظام اور سکھ شانتی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی بڑی ضرورت تھی گپت جی نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، اور 'کعبہ اور کربلا' کے عنوان سے اپنی ایک اہم نظم لکھی، اس میں ہندو مسلمانوں میں اختلاف کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کے بارہ میں محبت، ہمدردی اور خلوص کے جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے، اس نظم کے دو حصے ہیں، ایک کا تعلق کعبہ سے ہے اور دوسرے کا کربلا سے، پہلا حصہ ۳۱ مختصر نظموں کا مجموعہ ہے، یہ سب نظمیں الگ الگ تاثرات کی ترجمانی کرتی ہیں، اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف واقعات نظم کرتے ہوئے آپ کے زریں اقوال کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان واقعات کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی عظمت، نرم دلی، غریب نوازی، صبر و شکر، انسانیت وغیرہ اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے نمونے کے چند اشعار یہ ہیں

دسے، ہے بھیتری بھیتر تھیں جو تاپ　　　باہر نکال دو گرا سے وہ گپت پاپ

سن یوں نبیؐ سے سر اِک جن کا جھکا　　　گنت نج پاپ وہ کہہ کر نہ رکا

بچت جو دیکھا اسے یوں کہا عمرؓ نے　　　جائیں دبا آپ ہی کیوں لوگ لاجوں مرنے

بولے نبیؐ۔ چور بننے سے پر لوک ہیں　　　رہنا بھلا ہے یہاں تجا اور شوک میں[1]

اس تصنیف کا دوسرا حصہ 'کربلا' ایک مسلسل نظم ہے، اس کے کردار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسین علیہ السلام ہیں، اور موضوع بیان کربلا کا وہ دلدوز سانحہ ہے جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا، اس تصنیف کے متعلق ڈاکٹر کملا کانت تحریر فرماتے ہیں

"کربلا ایک سوتنتر (آزاد) کھنڈ کابیہ (مختصر مسلسل نظم) ہے، اس کے چرتر نایک (ہیرو) محمد صاحب کے ناتی امام حسین ہیں، جنھوں نے سودھرم نشٹھا (اپنے مذہب کے وقار) کے کارنہ اپنی اور اپنے پریجنوں (اعزہ) کی تتھا اپنے انویائیوں کی آتم ہونی (قربانی) دی ہے، یزید نے جسے شیطان کا پرتیک (نمایندہ) سمجھا جاتا ہے، پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دینے کیلیے انھیں (حسینؑ کو) ووش (مجبور) کیا ہے، کوی نے اس کرنٹر (پردرد) کتھا کا اوراتا (بالغ نظری) کرونا (ہمدردی) اور شردھا (عقیدت) کے ساتھ ورنن (بیان) کیا ہے، اس نے کربلا کے یگیہ (قربانگاہ) میں آریوں اتھات ہندوؤں کی آتم بل (قربانی) کا بھی آدر پوروک الیکھ (ذکر) کیا ہے۔" (متیھلی شرن گپت۔ وکیت اور کابیہ ص ۳۴۳)

حضرت امام حسینؑ کے متعلق گپت جی کا نظریہ بہت صاف اور نمایاں ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں

بہت سے شتروؤں (دشمنوں) کے سنگھار (ہلاکت) کی ابھیچھا (کے مقابلہ میں) ان کی دیرتا ان کے بلدان (قربانی) میں ہی اپنی وشیشتا (خصوصیت) رکھتی ہے، اسی پرکار ان کی کرنا (درد و غم کا احساس) ادھیر ہونے (صبر و تحمل کھو دینے) میں نہیں، گمبھیر ہونے میں ہی اپنا مہتو (اہمیت) پرکٹ کرتی ہے۔" (کعبہ اور کربلا۔ آدیدن۔ ص ۴)

---

[1] کعبہ اور کربلا ص ۳۸

گپت جی کے نزدیک جد وجہد ہی سے انسان عظمت حاصل کر سکتا ہے، اس کی تائید میں وہ کردار حسینؑ پیش کرتے ہیں، مسلمانوں نے قربانی اور بلیدان کی تاریخی روایت اپنے مذہب کے بلند کردار انسانوں سے حاصل کی ہے، کربلا کا یہ تعارف شاعر کے مقصد کی ترجمانی کرنے کے لیے کافی ہے ؎

یہی کربلا چھیترا ہا دیکھو یہ آگے   چمند رت بھی جہاں جان پڑتے ہیں جاگے
ننگی ہو کر بچی جہاں وہ دانوتا ہو   مر مرہ کر ہی بچی یہاں یہ انوتا ہے
ماتر بہتر منچ ادھر یہ ڈیرے ڈالے   پشو بائیس سہترا دھر تے لڑنے والے
ان کے پیچھے بھرا فرات ندی کا جل ہے   سوید بہاتا آپ مرستھل تاب کل ہے [1]

لیکن گپت جی کا یہ اتحاد کا جذبہ محض ان کی ذات تک محدود رہا، دوسرے شعرا نے اس طرف توجہ کرنا غالباً پسند نہیں کیا، ان باتوں کی روشنی میں ہم بآسانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ قومی شاعری کی حیثیت سے گپت جی کا مرتبہ بہت بلند ہے، ہندی کا کوئی دوسرا شاعر ان کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا، گپت جی کی وفات دسمبر ۱۹۶۴ء میں ہوئی، ان کے انتقال کے ساتھ ہی ہندی کا ایک دور ختم ہو گیا۔

رومانیت یا پریم تجاوادا

دویدی جی کے زمانے میں قومی شاعری کی کثرت رہی لیکن رومانی شاعری بھی کم نہ تھی، خود گپت جی کی تصانیف ساکیت اور یشودھرا رومانی شاعری کا قابل قدر سرمایہ ہیں، ہری اودھ اور رتناکر نے اس کی جانب خاص طور سے توجہ کی، ہری اودھ المیہ نظمیں لکھنے میں مہارت رکھتے تھے، انھوں نے پریہ پرواس اور ویدیہی بنواس دو پربندھ کاویوں کی تخلیق کی ہے، جن میں بالترتیب کرشن کے متھرا کے سفر اور سیتا کے بنواس کا ذکر ہے، پریہ پرواس کاویہ کی ابتدا "دوس کا اوسان" (دن کا زوال) سے ہوتا ہے، اس نظم میں ردیف و قافیے

[1] کعبہ اور کربلا ص ۱۰

کی قید سے آزادی کے باوجود ایسی موسیقیت ہے کہ دل بے اختیار وجد کرنے لگتا ہے، اس کی اشاعت پر دھرم مہامنڈل کاشی نے ایک عظیم الشان جلسہ کر کے شاعر کو ساہتیہ رتن کا خطاب عطا کیا اور ہندی کی ادبی دنیا نے ہری اودھ کو ملک الشعرا کے معزز لقب سے نوازا۔

شری کرشن گائیں چرانے کے بعد گوکل میں داخل ہوتے ہیں، ان کی آمد سے ساری گوپیاں مسرت کے ساگر میں ڈوب جاتی ہیں، لیکن دوسرے ہی لمحہ کنس کا یہ پیغام پہنچتا ہے کہ کرشن پہلی فرصت میں متھرا تشریف لائیں، اس سے سارے برج پر تفکر اور مایوسی کی فضا طاری ہو جاتی ہے، کنس کی تمام گذشتہ سازشوں کا چرچا ہوتا ہے، اور کرشن کے مستقبل کے متعلق خوف و ہراس میں ڈوبے ہوئے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، سنسان رات کی تاریکی میں ممتا کے آنسو یشودا کے رخساروں سے بہ کر فرش خاک میں جذب ہو جاتے ہیں، معصوم رادھا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، اس وقت رادھا اور کرشن کے تعلقات کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

لیکل کا دے ساتھ سنیہہ بھی   نپٹ نیروتا سنگ تھا بڑھا
پھر بھی ور بال سنیہہ ہی   پرنے میں پر ورتت تھا ہوا

رادھا کے دل میں ایک عجیب وغریب سوال پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی سہیلی للتا سے کہتی ہے کہ مجھے دوسروں کو تکلیف پہنچانا ہمیشہ سے برا لگتا ہے، دوسروں کی تکلیف دیکھ کر خود تکلیف محسوس کرتی ہوں، سخت اور تلخ باتوں سے کبھی کسی کے دل کو تکلیف نہیں پہنچائی، پھر میں یہ اس قدر تکلیف دہ بات کیوں سن رہی ہوں؟

جن من کلپانا میں برا جانتی ہوں   پر دکھ لکھ کے بھی میں نہ ہوتی سکھی ہوں
کہہ کر کٹو باتیں جی نہ بھولے جلایا   پھر یہ دکھدائی بات میں نے سنی کیوں؟

وہ مستقبل قریب میں آنے والے ہجر کے لمحات کے تصور سے باولی سی ہو جاتی ہے، اسے ساری فضا غمگین اور اداس نظر آتی ہے، صورتیں رونی سی بن گئی ہیں، گھر کاٹے کھاتا ہے، بے چین دل اچاٹ ہو کر سنسان جنگل میں بھاگتا دکھائی دیتا ہے،

یہ سکل وشائیں آج روتی رہی ہیں	یہ سدن ہمارا ہے ہمیں کاٹ کھاتا
من اچٹ رہا ہے چین پاتا نہیں ہے	بجن بپن میں بھاگتا سا ہے دکھاتا

نازک خیال شاعر ستاروں کا واسطہ دیکر رادھا کی زبان سے عجیب وغریب باتیں کہلواتا ہے، رادھا کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ستارے اپنی چمک سے دھارس بندھا رہے ہیں، وہ اپنے دل میں سوال کرتی ہے کہ کیا یہ ستارے جو اس درجہ مہربان ہیں، مجھ دکھیا کی بات سنیں گے؟ اگر یہ برائی بھلائی کے لیے اپنی جگہ نہ چھوڑیں تو رات کا خاتمہ نہ ہوگا، اور اس طرح میری بات بن جائیگی یعنی نہ صبح ہوگی نہ کرشن متھرا کے لیے روانہ ہوں گے،

چمک چمک تارے دھیر دیتے ہمیں ہیں	سکھی! مجھ دکھیا کی بات بھی کیا سنیں گے؟
پرہت رت ہوکے ٹھور کو نہ چھوڑیں	نش گت نہیں ہوگی بات میری بنے گی

اور پھر رادھا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب ہمارے دن پھر گئے ہیں، ستارے ہر لمحہ ماند ہوتے جارہے ہیں، وہ میری خواہش کیونکر پوری کرنے لگے ۔

دن پھل جب کھوٹے ہو چکے ہیں ہمارے	تب وہ پھر کیسے کام کے بھی بنیں گے
پل پل ات پھیکے ہو رہے ہیں ستارے	وہ سپھل نہ میری کامنا کو کریں گے

لیکن وقت اپنی رفتار سے بڑھ رہا ہے، رفتہ رفتہ ستارے ڈوبنے لگتے ہیں، رادھا کہتی ہے کہ اے سکھی اب تارے اپنا منہ کیوں چھپا رہے ہیں، کیا وہ میرا دکھ بھی نہیں دیکھ سکتے، کیا وہ تکلیف کو دور کرنے میں بالکل ناکام ہو کر شرم سے اپنا منہ چھپا رہے ہیں۔؟

سکھی! مکھ اب تارے چھپانے کیوں لگے ہیں	وہ دکھ دیکھنے کی تاب کیا ہیں نہ لاتے
پرم بپھل ہوکے آپدا ٹالنے میں	وہ مکھ اپنا ہیں لاج سے یا چھپاتے؟

دفعۃً صبح کی سپیدی پھیلنے لگتی ہے اور آسمان کا آنچل ہٹا کر شفق جھانکنے لگتی ہے، رادھا کو اس میں بھی غم کا پہلو نظر آتا ہے، وہ سوچتی ہے کہ یہ آسمان پر سرخی ہے، یا کسی حسینہ کا خون بہہ رہا ہے، چڑیاں بے قرار ہو کر بول رہی ہیں، آخر یہ چاروں طرف آگ سی کیوں لگی ہوئی ہے!

چھٹے نکٹ کیسی لالما دکھتی ہے	بہہ رودھر رہا ہے کونسی کامنی کا
بہنگ ابکل ہو ہو بولنے کیوں لگے ہیں	سکھی سکل وشا میں آگ سی کیوں لگی ہے

ہری اودھ جی کی اس تصنیف کو مہاویر پرساد جی دویدی نے ہندی کے لیے نئی چیز بتایا تھا اور اس کے منتخب حصوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ سرسوتی میں شائع کیا تھا، ہری اودھ جی کی دوسری تصنیف ویدیہی بنواس بہت زیادہ قابل ذکر تصنیف نہیں شمار کی جاتی، دوسری تصانیف میں چوکھے چوپدے، چبھتے چوپدے اور بول چال وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں،

دویدی یگ کے رومانی شعرا میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی کو بھی اہم مقام حاصل ہے، ان کا شمار رومانوی تحریک کے رہنماؤں میں کیا جاسکتا ہے، ملن، سوپن اور پتھک نامی منظوم داستانیں اپنی رومانی فضا کے لیے بہت مقبول ہوئیں، ترپاٹھی جی کی زبان سادہ، رواں اور شستہ تھی، اپنی تصنیف سوپن میں وہ صنفِ لطیف کے غرورِ حسن کی کس قدر خوبصورتی کے ساتھ منظر کشی کرتے ہیں،

ایک دوس میں نے اپون میں پشپت ایک گلاب دیکھ کر
بڑے پریم سے کہا۔ ہے پریئے کیسا ہے پرسوں یہ سندر
وہ اچرج سے لگی دیکھنے نج کپول میرے سمکچھ کسر
میں لجبت ہو گیا۔ بھولتا نہیں ہائے وہ درشیہ منوہر

مندرجۂ ذیل اشعار میں محب اور محبوب کے ہم آغوش ہونے کی یہ رومانی کیفیت بھی توجہ کی مستحق ہے۔

جب اس کے سوندریہ اور گن کا میں کرتا تھا سنکیرتن
میرے درگ سے لگ جاتے تھے اسکے اروہ نیلت لوچن
میرا کنٹھ ہار بنتی تھیں اس کی کومل بھجائیں اٹھ کر
ہو جاتی تھی پریم پربھا سے اسکے مکھ کی کانت منوہر

ترپاٹھی جی کی نظموں میں اس طرح کی بے شمار تصویریں ہیں جو پہلی ہی نظر میں دل کو متاثر کرلیتی ہیں،

انسانی قدروں کی ترجمانی فرانس کی قومی تحریک نے انسانی قدروں سے عوام کو روشناس کرادیا تھا، اس تحریک کے بنیادی اصول آزادی، بھائیچارہ اور مساوات تھے، اس تحریک سے انسان نے پہلی مرتبہ اپنے کو آزاد محسوس کیا تھا، ادب جو سماج کا آئینہ دار ہے اس نے اس تحریک کے اثرات کو قبول کیا۔ ہندی شاعری پر بھی رفتہ رفتہ زمانے کے خیالات و رجحانات کا اثر پڑنا شروع ہوا!

معجزات پر بغیر کسی جھجک کے یقین کرلینا اس سائنسی دور میں اہل علم کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے اس زمانہ میں کرشن پرم برہم نہ ہو کر ایک تاریخی مہاپرش کے روپ میں سامنے آئے، یہ عقیدہ کہ کرشن نے گووردھن پہاڑ اپنی انگلیوں پر اٹھالیا تھا، تقریباً ختم ہو جارہا تھا، ہری اودھ نے اسی خیال سے پہاڑ اٹھانے کی روایت کو ایک قابل قبول موڑ دیکر اس سائنسی دور کے انسان تک پہنچایا،

لکھ اپار پرسار گریندر میں — برج دھرادھپ کے پریہ پتر کا
سکل لوگ لگے کہنے اسے — رکھ دیا انگلی پر شیام نے

اس زمانے میں مذہب کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھا گیا، ایشور، کرشن اور رام کی شکل میں برج یا اودھ تک محدود رہنے کے بجائے ساری دنیا میں اپنے جلوے بکھیرتے نظر آئے، غریب کی آہوں میں، دکھیا کے آنسوؤں میں مفلس کی بیکسی میں اور محتاج کے نالوں میں ایشور کی جھلک نظر آئی۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے ایشور کو جہاں جہاں پایا اس کو ان اشعار میں دیکھئے!

ہے میرے پربھو ویاپت ہو رہی ہے تیری چھوی تربھون میں
تیری ہی چھوی کا وکاس ہے کوی کی وانی میں من میں
بالک کے کومل ادھروں پر مدھر ہاسیہ کی چھایا میں
ماتا کے نہ سوارتھ نیہہ میں پریم مئی کی مایا میں
اوشا کے چنچل سمیہ میں کھیتوں میں کھلیانوں میں
گاتے ہوئے گیت سکھ دکھ کے سرل سوبھاؤ کسانوں میں

ایشور کے جلوہ کو دنیا کی ہر شئے میں تلاش کرنے کا تصور ہی آگے چل کر چھایا واد کی شکل میں ہندی شاعری کا ایک اہم سرمایہ بن گیا جس کا آئندہ مطالعہ کیا جائے گا، مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دویدی یگ کے تمام تخلیقات میں شعراء اپنے ماحول کا ایمانداری سے تجزیہ کرکے اپنے تجربوں کی روشنی میں اسی کی عکاسی کرتے رہے، انھوں نے بھکتی کال اور ریتی کال کی قدروں سے حسب ضرورت استفادہ کیا، اور مغربی اثرات کی روشنی میں ہندی شاعری کو دنیا کی دوسری زبانوں کے ساتھ چلنے کی دعوت دی، خیالات کی ترجمانی کے لیے نئے نئے چھندوں کے استعمال سے ہندی شاعری میں بڑی وسعت پیدا کردی اور چھایا واد کے شعراء کے لیے طرز اور زبان کے ساتھ ہی ساتھ افکار کا بھی ایک مبہم خاکہ پیش کردیا۔

(باقی)

دیوان راقم

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی

مرزا محمد سعد الدین محمد مشہدی متخلص براقم کے والد حاجی خواجہ عنایت مشہد کے بڑے تاجروں میں سے تھے، بعض تذکروں میں بجائے عنایت کے غیاث لکھا ہوا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ خواجہ عنایت بحیثیت تاجر کے ہندوستان آئے اور ان کے ساتھ ان کے بیٹے راقم بھی یہاں آئے اور شاہجہاں[1] کے ایک مشہور امیر اسلام خاں مشہدی[2] کے دامن سے متوسل ہو گئے،

راقم کو ہندوستان بہت عزیز تھا،

بیاد ہند از بس حرف سبزاں بر زباں دارم زبانی نیست گویا برگِ ہندی در زباں دارم

نیز ان کا خیال تھا کہ اوروں کی طرح ان کا ہنر بھی وطن سے باہر ہی پہچانا جائیگا،

کسی نگشود راقم در وطن بال و پر شہرت فضای آشیاں کے جای پرواز رسا دارد

: یاران قدیم بود چشم الفتم دیگر چہ دانستم کہ خواہد شد وطن ہم غربت دیگر

مگر کچھ دنوں کے بعد یاد وطن ستانے لگی:۔

حرف وطن مگو کہ بدل باز گشت نیست موج سرشک تا سر مژگاں رسید را

میکند یاد وطن راقم و پیوستہ مرا رشک بر عشرت عضویست کہ بیجا گردید

سر انجام سفر پیوستہ در کنج وطن خواہم اگر دارم پر و بالے برائے آشیاں دارم

[1] ۱۰۳۶ھ ـ ۱۰۶۹ھ / ۱۶۲۶ء ـ ۱۶۵۸ء [2] اسلام خاں مشہدی، میر عبدالسلام مخاطب باختصاص خاں متوفی بسال ۱۰۵۷ھ / ۱۶۴۷ء

اور تھوڑے دنوں کے بعد راقم اصفہان واپس گئے، جس کی انھوں نے بڑی تعریف کی ہے:۔

گوشۂ چشمی اگر چوں سرخ داری در نظر آغباری ہست راقم از صفاہاں سرپیچ

بچشم در نیاید شوکت روی زمیں راقم سیہ چشم تمنا تا بخاکِ اصفہاں کردم

اصفہان میں محمد بیگ اعتماد الدولہ کی سفارش پر شاہ سلیمان صفوی[1] نے انھیں پہلے ہرات اور پھر پورے خراسان کا وزیر بنا دیا،

راقم نے ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء کے بعد بلکہ مؤلف نتائج الافکار کے قول کے مطابق ۱۱۰۰ھ ہجری ۱۶۸۸-۸۹ء میں انتقال کیا، اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے پیری کے مدارج کو اچھی طرح طے کیا تھا،

راقم ز پا فتاد و ہنوز آرزوی پیر صحرای حرص را بعصا سیر میکند

قامتم خم ز بار پیریہاست ساقیا وقت دستگیریہاست

راقم خود شاعر تھے اور شعرا کے مربّی بھی تھے، چنانچہ احسان مشہدی، عظیمای نیشاپوری[2] اور شوکت بخاری[3] کو ان کے مربی ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، شوکت بخاری انکی مدح میں کہتے ہیں

ستارۂ فلک اقتدار سعد الدین کہ سعد اکبر از و کرد استفادۂ نور

راقم صائب[4] کے شاگرد تھے، اور انھی نے یہ بظاہر بے معنی مشکل مصرع صائب کو دیا تھا کہ وہ اس پر مصرع لگائیں:۔

از شیشۂ بی می می بی شیشہ طلب کن

اور صائب نے یہ مصرع لگا کر اسے بہت بلند کر دیا:۔

حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن

[1] ۱۰۷۷ھ ـ ۱۱۰۵ھ / ۱۶۶۶ء ـ ۱۶۹۴ء [2] متوفی بسال ۱۱۱۱ھ / ۱۷۰۰ء ـ ۱۶۹۹ء

[3] متوفی بسال ۱۱۰۷ھ / ۱۶۹۶ء ـ ۱۶۹۵ء [4] متوفی بسال ۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۱ء ـ ۱۶۷۰ء

راقم نے بار بار صائب کی مدح سرائی کی ہے، اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں،

راقم از خوان دل تو بہ کہ صائب گوید — خوردن نعمت عالم غم عالم دارد

سخن را دلنشیں تر کردہ ام راقم کہ صائب گفت — زمین سرکش، نخل ناموزوں نمی گیرد

جواب آں غزل راقم کہ سلطان سخن گوید — ترا ہر کس کہ می بیند دگر خود را نمی بیند

ایں جواب آں غزل راقم کہ صائب گفتہ است — شعلۂ جوالہ ہم شمع است و ہم پروانہ است

ایں جواب آں غزل راقم کہ صائب گفتہ است — خشک مغز بیہائے من افزود ازیں دریای سیر

جواب ایں غزل راقم کہ می گوید کہ صائب گفت — ہنوز از روزن چشم غزالاں دود می خیزد

ایں آں غزل کہ صائب رنگیں بیان گفت — نزدیک من میا کہ زخود دور می شوم

صائب نے بھی ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، مثلاً

ایں جواب آں غزل صائب کہ راقم گفتہ است — تیغ دائم آب در جو دارد و خوں می خورد

اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے شعرا کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے، خاص کر وحید[1] کے بہت مداح نظر آتے ہیں:

زفیض فکر وحید است اینکہ راقم را — چو برگ لالہ ورقہا شود بدیوان سرخ

کہ راقم در سخن غیر وحید ایں رنگ میرزد — کہ ایں می در قدح رنگی نماید در سبو رنگی

خان آرزو نے لکھا ہے کہ راقم کا ایک دیوان نواب سیف خاں[2] کے پاس تھا، جسے میر محمد افضل ثابت[3] نے عاریۃً لیا تھا، مگر ان کے یہاں سے چوری ہو گیا، اس کے بعد پھر ان کے دیوان کا کوئی نسخہ انہیں نہ مل سکا، مؤلف خزانۂ عامرہ نے آرزو کے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ انھوں نے دیوان راقم کو نواب نظام الدولہ کے پاس دیکھا تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ اس سے انتخاب کریں، مگر اسی

---

[1] مرزا محمد طاہر قزوینی، متوفی بسال ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳-۹۴ء [2] متوفی بسال ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء
[3] متوفی ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹-۴۰ء

اثنا میں وہ شہید ہو گئے اور ان کا کتب خانہ تتر بتر ہو گیا، بہر حال کچھ دنوں کے بعد ان کو راقم کا ایک ضخیم دیوان ملا جس میں کچھ قصیدوں، رباعیوں اور قطعوں کے علاوہ زیادہ تر غزلیں تھیں، اور اس نسخہ کے شروع میں دو دیباچے تھے، ایک خود راقم کے قلم کا جو بقول اس مؤلف کے انتہائی متین اور رزین تھا، دوسرا محمد صادق مشہدی کا تھا، اس کی بھی مؤلف نے تعریف کی ہے، چونکہ دیوان راقم نادر تھا اس لیے اس مؤلف نے اس نسخہ سے کافی اشعار نقل کر لیے ہیں (۱۲۱ عدد) اور لکھا ہے کہ راقم کبھی کبھی غزلیں بھی کہتے تھے،

دیوان راقم کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے (نمبر ۳۳۲) اس میں جو مقدمہ ہے وہ محمد صادق مشہدی کا لکھا ہوا ہے، اور اس طرح شروع ہوتا ہے :-

ای برون از احاطۂ ادراک — قدست از نسبت تقدس پاک

تنظیم در بارکبریائی کہ کرسی نشینانِ عرش المعراج معرفت ......

غزلیں اس طرح شروع ہوتی ہیں :-

ای ذکر تو سررشتۂ تسبیح سخنہا — بی حمد تو پیمانۂ خالی ست دہنہا

دیوان راقم کا ایک دوسرا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے (نمبر ۱۸۷) اس نسخہ میں پہلے ائمہ کی مدح میں قصیدے ہیں، اس کے بعد صادق مشہدی کا مقدمہ ہے، پھر غزلیں ہیں جو اس طرح شروع ہوتی ہیں :-

ای ہر زبان بذکر تو گرم فسانۂ — قصد سخن زسبحۂ حمد تو دانۂ

برٹش میوزیم کے نسخہ والی پہلی غزل اس نسخہ کے بیسیوں ورق پر ہے، آخر میں اس نسخہ میں دو رباعیاں بھی ہیں، دیوان راقم کے ایک نسخہ کا ذکر اسپرنگر کی فہرست میں بھی ہے (نمبر ۴۶۳) دیوان راقم کا ایک قلمی نسخہ کابل میوزیم میں بھی ہے (نمبر ۸۰) جس کے کچھ اوراق بیچ سے

غائب ہیں، اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں وہ مقدمہ ہے جو خود راقم نے لکھا تھا، اور جو اس طرح شروع ہوتا ہے -

"بندہ راقم ...... سعد الدین ......

راقم کو عام شعرا کی طرح اپنے کلام پر فخر ہے :-

ز نو بہار چہ منت کشم بیا راقم
بیا کہ گلشنِ فکر از تو آب و رنگ گرفت

انھوں نے زمانہ کی بیقدری اور لوگوں کی بیوفائی کا رونا رویا ہے :

بسکہ بیقدر ست راقم در زمان آسخن
معنی برجستہ جز حرمت ز خاطر جستہ نیست

نوشتن است نامہ راقم بدوستاں
اظہار اتحاد زماں این قدر بس است

وہ تقدیر پرستی کے شکار معلوم ہوتے ہیں :-

دست دل در حلقۂ تقدیر می باید زدن
پشت پا بر عالمِ تدبیر می باید زدن

انھوں نے اپنی غزلوں میں عینک اور نوخطوں کا ذکر کیا ہے :-

بعینک بایدم با نوخطاں کردن نظر بازی
نبرد از خاطرم پیری تمنای جوانی را

ان کے بعض اشعار عالمگیر کی مدح میں ہیں

شاہد ملک است مخمور و تو عشرت میکنی
اینکہ ساغر می زنی شمشیر می باید زدن

دست بردل یافتم راقم بامداد جنوں
لاف از اقبالِ عالمگیر می باید زدن

راقم کی غزلیں عام طور سے متوسط درجہ کی ہیں، مگر بعض اشعار بہت بلند ہیں، جن میں سے کچھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

خوش آرزوی کہ خم خم بادہ می خوردم کنوں راقم
بیک خم می کشیدن گشتہ ام بدنام مستیہا

ساقی بقدح ریز می توبہ شکن را
تا از سخن توبہ بشوییم دہن را

تا ہمسفران لب بنصیحت نکشانید
بردیم بغربت ہمہ جا خاکِ وطن را

اشکم عناں کشید وگرنہ بہ بوی تو
از راہ بردہ بود نسیم سحر مرا

یارتا گردیدہ ہرجائی ز شوخیہای ناز
ہر طرف باز است آغوشِ تمنای ما

نیست تنہا سر ما خاک رہِ او راقم
ذرہ تا مہر دراں کو بسجدہ آمدہ است

ہمیں دل آرزوی آں سر کو کردہ است
ہر سر مو سجدہ با نذر در او کردہ است

ہمہ باشید کہ ہنگام ز خود رفتنہا
ہر کہ برخاست ازیں معرکہ تنہا برخاست[1]

ازبسکہ در گرفتنِ ساغر حجاب داشت
مینا بجای می عرق آفتاب داشت

بزم وصال چارۂ بیتابیم نکرد
پہلو نشینِ من ہمہ جا دل طپیدن است

دیدہ ام شاخِ گلی بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بکید ست این قدر ساغر گرفت

خیرہ شد چشم دو عالم ز تجلی و ہنوز
کس ندانست کہ آں شمع کجا می سوزد

امروز محتسب رہ میخانہ میزند
بر کاروان شیشہ و پروانہ میزند

دل رمیدہ کجا با من آشنا باشد
ہمیں قدر کہ تو در دیدہ کجا باشد

ز چشم شوخ تو بیگانہ خوی بی پروا
ندیدہ ایم نگاہی کہ آشنا باشد

چوں خضر طی نشیب فرازی نکردہ ام
خود را اسیر عمر درازی نکردہ ام

با آنکہ پے بسر حقیقت نبردہ ام
لب آشنا بحرف مجازی نکردہ ام

نہ بوی گل شناسم و نہ صوت عندلیب
ہرگز نظر بناز و نیازی نکردہ ام

حرف تمکین چند ولافِ خاکساری تا بکی
زیر دست آسمانی بردباری تا بکی

---

[1] صائب کا شعر ہے:

شب کہ صحبت بحدیث سر زلف تو گذشت
ہر کہ برخاست ز جا سلسلہ برپا برخاست

خندۂ برقِ نہالم، اگلی بر سر زد — برسرِ من گریۂ ابرِ بہاری تا بکے

بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں، جن کو سبک ہندی کا نمونہ اور پیچیدہ کہنا زیادہ زیادہ مناسب ہوگا. مثلاً

بکارِ عشق مرا عشق مصلحت بین است — فغاں کہ قفلِ ز آتش کلید چوبین است

با تامل گوشہ گیر خلوتِ داماں نشد — پای خواب آلودِ ما فکر جہاں گردیدہ است

گرہ حجابش گرہ از بند قبا وا میکرد — خار در پیرہن شوخیِ گلہا می کرد

در آں دریا حبابم کار کشتی می کند راقم — کہ از ہر موج خارا رۂ پشتِ نہنگ آید

یاد مرہم چوں توانم کرد جای کز غزور — زخم دلہا رخنۂ دیوار نسیاں می شود

اس میں غزلوں کے بعد قصیدے ہیں، جو ناقص ہیں، ان میں شاعر نے حضرت علیؓ، شاہ سلیمان وغیرہ کی مدح کی ہے، کچھ اشعار نمونہ کے یہ ہیں

ایں آستاں کیست کہ عقلِ ادب شناس — نتواند نقش بسجدہ دہد جبہۂ قیاس

ایجاد راجہات تناہی درآں محال — تقسیم را بنہای نقد داز آں اساس

ماخذ

محمد افضل سرخوش : کلمات الشعراء ، دین محمد پریس ، لاہور

میر غلام علی آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ ، مطبع نولکشور

سید محمد صدیق حسن : شمع انجمن ، رئیس المطابع شاہجہانی

فانوس خیال، نسخۂ خطی شمارہ $\frac{92}{25}$ (سلیمان کلکشن) علی گڑھ،

میر غلام علی آزاد بلگرامی : سرو آزاد ، مطبع دخانی رفاہ عام، لاہور ۱۹۱۳ء

علی قلی خاں والہ داغستانی : ریاض الشعراء، نسخۂ خطی شمارہ ۵۸.۳۷، نیشنل میوزیم، نئی دہلی،

قدرت اللہ گوپاموی : نتائج الافکار ، چاپخانۂ سلطانی بمبئی

A. Sprenger: A catalogue of The Arabic, persian and Hindu-stany Manuscripts of The library of The Kings of oude, 1854.

Wladmir Ivanow: Concise Descriptiv catalogue of The Persian manuscripts in The collection of The Asiatic society of Bengal Calcutta

Charles Rieu: Catalogue of The Persian Manuscripts in The British Museum (Supplementary

---

تاریخ پیدائش و وفات حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی

از جناب سید وحید اشرف صاحب، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا نام ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں، سلسلۂ اشرفیہ جو آپ ہی کی جانب منسوب ہے، پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، آپ کی عملی زندگی علمی حیثیت اور ادبی اہمیت کی وجہ سے آپ کی ذات ارباب علم کے لیے خاص توجہ کی مستحق ہے، لیکن اکثر صوفیہ کی طرح آپ کے حالات بھی تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں، آپ کے سوانحِ حیات پر مشتمل متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان سب کا ماخذ آپ کے ملفوظ ہیں، جو لطائف اشرفی کے نام سے موسوم ہے لیکن خود یہ ملفوظ بھی تحریف و الحاق سے خالی نہیں، یہاں تک کہ آپ کی تاریخِ پیدائش و وفات بھی اب تک جو مشہور ہے وہ صحیح نہیں۔

آپ کی تاریخِ پیدائش کا ذکر نہیں ملتا، البتہ تاریخِ وفات لطائف کے مختلف نسخوں[1] اور دوسرے تذکروں میں اختلاف کے ساتھ ملتی ہے، ان کتابوں میں وفات کی حسب ذیل تاریخیں ملتی ہیں: ۷۹۲ھ، ۷۹۸ھ، ۸۰۸ھ اور ۸۴۰ھ[2]۔ اس صدی کے تمام تذکرہ نگار

[1] لطائف اشرفی کے مختلف نسخوں اور دوسرے تذکروں میں آپ کی وفات اسی طرح درج ہے
(الف) لطائف اشرفی خطی ضمیمہ لٹن نمبر ۹ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: ۷۹۲ھ (ب) لطائف اشرفی خطی سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: ۷۹۲ھ متن میں اور حاشیہ میں ۷۹۸ھ حروف میں تحریر ہے (ج) لطائف اشرفی خطی لٹن نمبر ۳ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: ۸۰۹ھ (د) لطائف اشرفی خطی ملوکہ مولوی سید تدبیر احمد کچھوچھوی: ۸۰۸ھ (ہ) لطائف اشرفی مطبوعہ: ۷۹۵ھ (و) مرآۃ الاسرار: ۸۰۸ھ (ز) اخبار الاخیار: ۸۰۸ھ (ح) طبقات شاہجہانی: ۸۴۰ھ

جنھوں نے آپ کے حالات قلمبند کیے ہیں، وہ ۸۰۸ھ پر متفق ہیں[1]،

مندرجہ ذیل دلائل سے ۷۹۲ھ اور ۷۹۸ھ دونوں تاریخیں غلط ثابت ہوئی ہیں:

لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی دونوں میں تیمور اور ملو خاں کی جنگ کا تذکرہ ہے، یہ جنگ ۸۰۱ھ میں واقع ہوئی[2]، مثلاً

(ا) ایک خط[3] میں سید اشرفؒ سیف خاں کو لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ چوں صاحبقران راظفر بخشید و کار ملو خاں بہزیمت انجامید ہر یک از اکابر ولایت و مآثر حمایت خویش میگفت ہر فتح و ظفر کہ میسر شدہ تخصیص فتح ہندستان از ہمت رجال الغیب و ہمت عمال الغریب بر دست آمدہ"۔

(ب) مکتوبات اشرفی میں ابراہیم شاہ شرقی کے نام ایک خط[4] میں حضرت شیخ نور بنگالی کے ایک خط کا حوالہ دیا گیا ہے، جس میں حضرت شیخ نور کے ۲۱ اشعار نقل کیے گئے ہیں، اس میں دہلی پر تیمور کی فتح کا بھی ذکر ہے، اس کے دو شعر یہ ہیں:

چرا صاحبقراں از فتوی دین ۔۔۔ فرو زد تخت دہلی میر تیمور

دو سہ امری کہ دیدہ نامناسب ۔۔۔ بہم بر زد چو دہلی شہر معمور

(ج) شیخ حسین کے نام بھی ایک خط میں دہلی پر تیمور کی فتح کا ذکر ہے[5]:

"سلطان السلاطین ابراہیم جونپوری ازیں فقیر التماس کردہ کہ حضرت قطب الولایت شیخ نور بنگالی استغاثہ کردہ کہ ولایت بنگالہ از زمان محمد بختیار خلج کہ امرای سلطان السلاطین و برہان الخواقین شمس الدین التمش بود ۔۔۔۔۔۔ اکنوں عرصۂ اسلام بگرد کفر آلودہ میگردد ایں

[1] مثلاً دیکھئے محبوب یزدانی مؤلفہ سید نعیم اشرف جائسی ص ۱۳۰، مناقب اشرفیہ مؤلفہ سید اعجاز احمد ص ۱۰، مقدمہ سیر الاشرف ص ۸۰ وغیرہ [2] ظفرنامہ جلد ۲ ص ۷۰، [3] مکتوبات اشرفی مکتوب نمبر ۴۲ [4] ایضاً مکتوب نمبر ۴۵ [5] ایضاً مکتوب نمبر ۴۷

درویش در جواب گفت زہی سعادت...... کہ سلاطین نامدار...... در استعانت مظلومان و حمایت ستم دیدگان صرف کنند...... امیر تیمور گورگان دیار اسلام دہلی را...... بعسا کر قاہرہ تاختند۔"

اس خط میں ابراہیم شرقی کو راجہ کنس پر حملہ کے لیے لکھا گیا ہے، جو بنگال کا فرمانروا تھا، آگے کی بحث سے یہ ظاہر ہوگا کہ یہ خط ۸۱۰ھ سے قبل کا نہیں ہو سکتا، یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ابراہیم شرقی کی جانشینی یعنی ۸۰۴ھ کے بعد[1] تک آپ بقید حیات تھے، اسکی تائید مندرجۂ ذیل شہادتوں سے ہوتی ہے:

(۱) حضرت سید اشرف نے اپنے خط میں ابراہیم شاہ کو سلطان السلاطین کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔

(ب) ایک خط کے الفاظ صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خط سلطان ابراہیم کی تخت نشینی کے بعد لکھا گیا، وہ الفاظ یہ ہیں:

"مثال سلطنت شکوہ مرقوم الاقبال مملکت مژدہ کہ از اوج انا جعلناک خلیفۃ باحکی واز موج بحر اطیعوا اللہ و رسولہ و اولی الامر منکم شرف نفاذ یافت باطلاع آں سرور بی انتہای و باطلاع آں حضور بی فتہای روی نمود۔"

گل بوستان خلیل اللّٰہی	دمید از گلستان شاہنشہی
رسیدہ ازاں گل ہم بوی دوست	کہ اندر دماغ جہاں بوی اوست

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، آپ کی تاریخ وفات ۸۰۸ھ مشہور ہے، اور اسی پر اکثر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے، لیکن مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر یہ تاریخ بھی صحیح نہیں ہو سکتی،

(۱) حضرت سید اشرفؒ کا ایک خط ہوشنگ خاں غوری شاہ مالوہ کے نام مکتوبات اشرفی میں موجود ہے، یہ خط ہوشنگ کی تخت نشینی کے موقعہ پر لکھا گیا،

ہوشنگ کی تخت نشینی کی تاریخ باختلاف روایت ۸۰۸ھ[2]، ۸۰۹ھ[3] اور ۸۱۰ھ[4] ہے،

[1] طبقات اکبری ج ۳ ص ۲۷۵، تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵ وغیرہ [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۳۶ [3] طبقات اکبری ج ۳ ص ۲۸۹ [4] فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم مرتبہ چارلس ریو ج ۱ ص ۴۱۲

ان میں ۸۱۰ھ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہوشنگ خان اپنے والد دلاور خاں کی وفات کے بعد مظفر شاہ گجراتی کے ہاتھوں مقید ہو گیا، اور ۸۱۰ھ میں رہا ہوا، اس کے بعد وہ مندو دارالسلطنت مالوہ کا پر قابض ہوا، اور جشن تاجپوشی منایا، لیکن اگر ۸۰۸ھ کو ہوشنگ کی تاجپوشی کا سال تسلیم کر لیا جائے تب بھی حضرت سید اشرفؒ کی تاریخ وفات ۸۰۸ھ نہیں ہو سکتی، کیونکہ لطائف کے تمام نسخے متفق اللفظ ہیں کہ آپ کا وصال ۲۸ محرم کو ہوا، اور اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے، اول تو یہ معلوم نہیں کہ ہوشنگ کس مہینہ میں تخت نشین ہوا، اور اگر بالفرض وہ سال کے پہلے ہی ماہ میں تخت پر بیٹھا تو اتنی قلیل مدت میں مندو سے کچھوچھہ اور کچھوچھہ سے مندو کو اس زمانے میں خط کا پہنچنا محال نظر آتا ہے، اس لیے یقیناً یہ خط ۸۰۸ھ کے بعد لکھا گیا،

(۲) لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی دونوں میں آپ کے سفر گلبرگہ اور خانقاہ سید محمد گیسو دراز میں قیام کا ذکر ملتا ہے[1]، سید حمید الدین کے نام ایک خط[2] میں حضرت سید اشرفؒ لکھتے ہیں:

"از آنجملہ سادات گیسو درازاند...... بغایت عالی شان کہ تصنیفات رایقہ و تالیفات لایقہ از آنحضرت سر بر زدہ اند، سیر اخیر التصنیفات حضرت میر است...... در سیر نخستین کہ بجانب میر شدہ ملازمت حضرت میر بہ نخواہ شدہ، در سیر ثانی بحضرت شاہ ید اللہ و شاہ صفی اللہ ملازمت و شرف یافتہ۔"

مندرجۂ بالا بیان سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) حضرت سید اشرفؒ نے گلبرگہ کا سفر اس وقت کیا جبکہ حضرت گیسو درازؒ گلبرگہ میں مقیم ہو چکے تھے، یعنی ۸۰۳ھ کے بعد[3]۔

[1] دیکھئے لطائف اشرفی ج ۱ ص ۳۰۶ اور مکتوبات اشرفی مکتوب نمبر ۲۳ [2] مکتوبات اشرفی مکتوب نمبر ۲۳ [3] تاریخ حبیبی ورق ۲۲۔ یہ کتاب حضرت سید محمد گیسو درازؒ پر دو قدیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے، دوسری کتاب سیر محمدی ہے، اسلیے ان کتابوں کی شہادت کے سامنے بزم صوفیہ (ص ۴۹۴) کی یہ روایت کہ حضرت گیسو درازؒ ۸۰۰ھ میں گلبرگہ پہنچے اور روضۃ الاولیا کی روایت کہ آپ گلبرگہ ۸۱۵ھ میں پہنچے، دونوں غیر معتبر ہیں۔

(ب) اس وقت حضرت گیسو درازؒ اپنی کتاب سیر النبی تصنیف کر چکے تھے، جو ۸۰۱ھ[۱] کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی، اس لیے آپ کا پہلا سفر دکن ۸۰۱ھ کے بعد ہوا ہوگا۔

(ج) گلبرگہ کے دوسرے سفر میں حضرت گیسو درازؒ کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ آپکے پوتے شاہ ید اللہ اور شاہ صفی اللہ کا ذکر ہے، حضرت گیسو درازؒ کا وصال ۸۲۵ھ میں ہوا، اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آپ کا دوسرا سفر گلبرگہ ۸۲۵ھ کے بعد ہوا ہوگا۔

(۳) لطائف اشرفی میں حضرت گیسو درازؒ کی تاریخ وفات بھی موجود ہے[۲]، یعنی حضرت سید اشرفؒ، حضرت گیسو درازؒ کی وفات کے بعد (۸۲۵ھ کے بعد) بقید حیات تھے۔

(۴) حضرت سید اشرفؒ نے تین خطوط بنگال کے راجہ کنس کے دور حکومت میں لکھے گئے، ایک خط ابراہیم شرقی کے نام[۳]، دوسرا حضرت نور قطب عالم کے نام[۴]، اور تیسرا شیخ حسین کے نام، جس میں شیخ کے دو لڑکوں کی شہادت پر اظہار تعزیت کیا ہے[۵]

کنس ۸۱۷ھ میں بنگال کے تخت پر قابض ہوا تھا، ابراہیم شرقی کی آمد کی خبر سنکر خود

---

[۱] سیر محمدی جو حضرت گیسو درازؒ پر قدیم ترین کتاب ہے اور جس کا مصنف خود سفر گلبرگہ میں حضرت گیسو درازؒ کے ہمراہ تھا، (دیکھیے سیر محمدی ورق ۷۰) اس میں آپ کی تصانیف کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے،

"تصانیف و تالیف حضرت قطبی دو قسم اند، اول آنست کہ ہم در دہلی و اندر اثنای راہ احسن آباد نوشتہ بودند، قسم دوم کہ در برکت شہر احسن آباد نوشتہ بودند، قسم اول آنکہ..... قسم ثانی آنکہ در شہر احسن آباد (گلبرگہ) نوشتہ بودند یکی ترجمہ مشارق در ایام شہور ۸۰۱ھ، دوم سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ از شیخ الاسلام سراج الملت والدین خادم نوشتہ بودند......" (ورق ۸۰ - ۱۲۸)

[۲] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۳۷۶ [۳] مکتوبات اشرفی مکتوب نمبر ۴۵ [۴] ایضاً نمبر ۴۶ [۵] ایضاً مکتوب نمبر ۴۷

تخت سے دست بردار ہو گیا، اور اپنے نو مسلم لڑکے جلال الدین (پہلے جس کا نام جمل یا جتمل تھا) کو بنگال کا فرماں روا بنا دیا، یہ خبر سنکر حضرت نور قطب عالم نے ابراہیم شرقی سے سفارش کی کہ وہ اپنی فوج کو واپس لے جائے، کیونکہ بنگال کنس کے مظالم سے نجات پا گیا ہے، لیکن ابراہیم شرقی کی واپسی پر کنس پھر تخت پر قابض ہو گیا، ۸۱۲ھ میں جلال الدین نے کنس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور ۸۳۷ھ تک حکومت کی[۱]، اس لیے حضرت سید اشرفؒ کے یہ تینوں خطوط جو کنس کے مظالم سے متعلق ہیں ۸۱۷ھ اور ۸۲۱ھ کے درمیان ہی لکھے گئے ہوں گے

تاریخ وفات متعین کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ تاریخ پیدائش پر غور کر لیا جائے۔ سمنان چھوڑتے وقت حضرت سید اشرفؒ کی عمر کے متعلق لطائف اشرفی میں دو متضاد بیانات ملتے ہیں، ایک سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بیس سال کی عمر میں وطن کو خیرباد کہا، لطائف کے الفاظ یہ ہیں:

---

[۱] فرمانروایان بنگال کے دور حکومت کے لیے دیکھیے:-

Islamic culture 1958, Vol XXXII No. 28. 195-207, under The Title "Some New Data Regarding The Pre-Mughal Muslim Rulers of Bengal" by Z. Desai; JASB 1952 Vol XVIII P. 122-259 under The Title "The House of "Ganesh" by A.H. Dani and History of Bengal Vol II P. 116-129 by J.N. Sarkar.

"چوں در سلطنت رانی و مملکت گیہانی بست سال شدہ اند و بہ نسبت صوری و معنوی محافظی بود لاندو از روی ظاہر بہاست ملکی بسر بردہ اند اتفاقاً در عشرۂ اخیر ماہ مبارک رمضان شبہای متبرکہ کہ منسوب بشب قدر بودہ زندہ داشتند ..... حضرت خضر علیہ السلام نمود ارشد و بزبان فصیح بہ نسبت حضرت قدوۃ الکبریٰ فرمودند ..... رو بسوی بلاد ہندآر"[1]

دوسری جگہ نظام یمنی لکھتے ہیں کہ حضرت سید اشرفؒ جب بنگال میں وارد ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۲۰ سال کی تھی[2]

حضرت نور العین خاتمۂ مکتوبات اشرفی میں لکھتے ہیں کہ حضرت سید اشرفؒ کی رسم تاجپوشی[3] ۱۵ سال کی عمر میں ہوئی اور ۱۲ سال آپ نے حکومت کی، اس کے بعد ۲۷ سال کی عمر میں ترک وطن کیا[4]

جس وقت آپ سمنان سے جدا ہو رہے تھے، حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی بقید حیات تھے، اور سفر میں چند منزل آپ کے ہمراہ رہے، شیخ علاء الدولہ کی تاریخ وفات ۷۳۶ھ ہے[5] اس وقت سید اشرفؒ کی عمر ۲۰ یا ۲۷ سال کی رہی ہوگی، اس لیے آپ کی تاریخ پیدائش (۷۳۶ھ - ۲۰) = ۷۱۶ھ یا (۷۳۶ھ - ۲۷) = ۷۰۹ھ ہوئی۔

---

[1] لطائف اشرفی جلد ۲ ص ۹۲ [2] لطائف اشرفی ص ۷۹، ۳ [3] مکتوبات اشرفی سبحان اللہ کلکشن، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ورق ۱۶۰) [4] نفحات الانس ص ۴۳۹

بزم صوفیہ

یعنی عہد تیموری سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، ابو علی قلندر پانی پتیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات۔ ضخامت ۵۳۸ صفحے، قیمت: ۲۵ روپیہ

مینجر

تلخیص و تبصرہ

امریکہ میں اسلام

متحدہ امریکہ کے مسلمانوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے، بعض ذرائع سے کبھی ان کی تعداد ۳۲۵۰۰۰ کبھی ۵۰۰۰۰ اور کبھی ۶۰۰۰۰ معلوم ہوتی ہے،

امریکہ میں مسلمان مشرق وسطیٰ و شمالی افریقہ کی مسلم سلطنتوں البانیہ اور یوگوسلاویہ سے آئے، کچھ مسلمان مشرقی یورپ سے بھی آئے جس میں وسط ایشیا کے تاتاری اور ترکی بھی شامل ہیں، یہاں جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان بھی آباد ہیں،

مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ریاست مشی گن کے شہر ڈی ٹرواٹ میں پائی جاتی ہے، جو موٹر کاروں کی صنعت کا مرکز ہے، یہاں تقریباً ۱۵۰۰۰ مسلمان ہیں، نیویارک میں ان کی تعداد لگ بھگ ۳۰۰۰ اور شکاگو میں ۲۵۰۰، ٹولیڈو میں جو ریاست اوہیو میں واقع ہے ۱۵۰۰ ہے، متحدہ ریاستوں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں پھیلی ہوئی ہیں، ۱۰۰۵ کے قریب شہر سیراملینکا میں اور ۹۰۰ سکرامنٹو میں ہیں جو کالیفورنیا کے حدود میں واقع ہے،

شروع میں جو مسلمان مہاجر یہاں آئے، انھوں نے مختلف صنعتوں اور پیشوں کو اختیار کر لیا اور اب ان میں سے اکثر کی علمی اور تہذیبی حیثیت بہت بہتر ہو گئی ہے، یہ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے ہیں،

مشرق وسطیٰ سے آنے والے مسلمانوں کی اکثریت تجارت پیشہ ہے، ان میں بعض لوگوں کے پاس شروع میں تھوڑا سرمایہ تھا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر اپنے سامان کا لین دین کرتے رہے، جس سے ان کو اتنی کامیابی ہوئی کہ وہ بڑے بڑے کاروبار کرنے لگے، ٹولیڈو کے مسلمانوں کے قبضہ میں شاندار ہوٹل، شکاگو کے لوگوں کے پاس کپڑے کی ملیں اور سیرا بلنکا کے رہنے والوں کے پاس سبزی کی دوکانیں ہیں، یہ لوگ عربی زبان میں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیکن قرأت کا فن اچھی طرح نہیں جانتے، اسلامی تعلیم اپنے بزرگوں سے حاصل کرتے ہیں، لیکن جہاں ان کی تعداد زیادہ ہے، وہاں کے لوگ اس علاقہ کے امام سے دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہاں مسجدیں ہیں جن میں نماز باجماعت ادا کیجاتی ہے، لوگوں کو اسلامی احکام و تعلیمات سے واقف کرانے کے لیے کچھ اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں،

ریاست کالیفورنیا کے شہر سکرامنٹو میں پاکستانی مہاجرین آباد ہیں، ان میں سے اکثر لوگ زراعت اور کاشتکاری کرتے ہیں، جن کے پاس بڑے بڑے فارم ہیں، ان سے ہزاروں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے، سب سے بڑا پلاٹ فضل محمد خاں کا ہے، جو کالیفورنیا کے شہر یوسٹن کے قریب واقع ہے،

نیویارک کے پاکستانی مسلمانوں کی ایک خاص انجمن بھی ہے، جس کے سربراہ سید علی ریاج ہیں، یہ انجمن نیویارک میں آباد پاکستانی مسلمانوں کے دینی امور اور معاملات پر توجہ دیتی ہے، یہاں کے اکثر مسلمان کارخانوں میں کام کرتے ہیں، یا مشرقی کھانوں کے ہوٹل چلاتے ہیں،

بروکلین میں یمنی باشندوں کی آبادی ہے، ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان لوگوں میں یمنی خصوصیات برقرار ہیں، وہ زیادہ تر کارخانوں، ملوں اور لیبورٹریوں میں کام کرتے ہیں،

نیویارک میں سوڈانی، شامی اور لبنانی ہیں، یہ لوگ وہاں کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ میل اور محبت سے پیش آتے ہیں،

حبشیوں نے امریکہ میں اسلام کی تبلیغ کا بڑا کام کیا ہے، ان میں سے دو آدمی قابل ذکر ہیں، جنھوں نے

۱۹۳۱ء میں نیویارک کے حبشیوں کے ایک خاندان ہارلیم میں اسلام پھیلایا ان میں سے ایک کا نام صوفی عبدالحمید تھا جن کی نشو ونما شکاگو میں ہوئی، وہ ایک عرصہ تک مشرق وسطیٰ میں بھی رہے، دوسرے بزرگ حافظ حکیم تھے، جو اسلامی علوم کے بڑے ماہر تھے، ان کی دعوت سے اکثر حبشی متاثر ہوئے، انھوں نے خصوصیت کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اسلام ہی مذہب مساوات ہے، وہ عربی اور عجمی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اس کا معیار بس تقویٰ ہے، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ شخص ہے، جو اس سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، اللہ لوگوں کے رنگ اور صورتوں کو نہیں دیکھے گا، بلکہ ان کے دلوں اور ایمان کا خیال کرے گا،

انھوں نے اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ اس کی نرمی، لینت، آزادی اور حریت کی تعلیمات کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ ہارلیم خاندان کے حبشیوں کی ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی،

صوفی عبدالحمید کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسی بازار میں اونچی جگہ پر کھڑے ہو جاتے اور حبشیوں کو متوجہ کرکے اسلام کی دعوت دیتے، کبھی چوراہوں کے چبوتروں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچاتے، اور اپنی موثر خطابت، زور بیان، قوت استدلال اور مدافعانہ جوابات سے جو اسلام کی خیر و برکت کے طفیل میں ان کو حاصل تھے، حبشیوں کے دلوں میں اسلام کا صحیح نقش بیٹھا دیتے، حافظ حکیم نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے، یہ لوگ برابر لوگوں کو اپنے دینی وعظ و ارشاد کی مجلس میں جو ایک خاص گھر میں منعقد ہوتی تھی، بلاتے تھے، ۱۹۳۶ء میں شرکاء کی تعداد ۳۰۰ تھی جن میں ۲۵۰ مسلمان ہو گئے، افسوس ہے کہ ایک ہی سال بعد یعنی ۱۹۳۷ء میں یہ مفید سلسلہ ان دونوں بزرگوں کی موت سے ختم ہو گیا، صوفی عبدالحمید کی وفات ایک ہوائی حادثہ میں اور حافظ کی وفات بھی اسی سال ایک شدید بیماری کی وجہ سے ہوئی،

۱۹۳۸ء میں صوفی عبدالحمید اور حافظ حکیم کے ایک شاگرد عبدالودود نے ہارلیم میں مغربی

اسلامی مرکز کی تاسیس کی، اور اپنی بیوی کے اشتراک سے نیویارک کے حبشیوں میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے دینی اجتماعات منعقد کیے، ۱۹۴۲ء میں ایک ہندوستانی خاتون بیگم جلیہ نے ایک دینی درسگاہ قائم کی اور عبدالودود نے ۲ سال بعد ایک بین الاقوامی اسلامی انجمن کی تشکیل کی۔

محمد جواد تشیری نے جو امریکہ میں اسلام کے خادم کہے جاتے ہیں، ریاستہائے متحدہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ میں بڑا اہم حصہ لیا، ان کی نشو و نما عراق کے شہر نجف میں ہوئی تھی، ۱۹۳۶ء میں انھوں نے لبنان کا سفر کیا جہاں ان کے خاندان کے بقیہ لوگ رہتے تھے، یہاں انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے دین و شریعت کے اصول پڑھائے، جب ڈی ٹرائٹ کے بعض لبنانی مسلمانوں کو اسکی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان کو وہاں کے قیام کی دعوت دی تاکہ وہ بڑے لوگوں کو اسلامی قانون بتائیں، اور بچوں کو بنیادی تعلیم دیں، مارچ ۱۹۴۹ء میں وہ وہاں گئے اور پہلے عربی پڑھانا اور خود انگریزی سیکھنا شروع کیا، اور اس میں اچھی مشق بہم پہنچائی، امریکہ کے مسلمانوں نے ان کو خادم الشریعۃ الاسلامیہ کا لقب اس لیے دیا تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی دین کی خدمت و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی،

ٹولیڈو میں شیخ کامل عود تیش نے اسلام کی تبلیغ و دعوت کا کام کیا، ان کی تعلیم یوگوسلاویہ کی اسلامی یونیورسٹی میں ہوئی، پھر انھوں نے جامعہ ازہر سے ڈگری حاصل کی، اور قاہرہ میں درس تدریس اور ترجمہ کا کام شروع کیا لیکن ۱۹۴۶ء میں شکاگو کے مسلمانوں نے ان کو امام کی حیثیت سے بلا لیا، ۱۹۵۵ء میں وہ ٹولیڈو چلے آئے اور عربی زبان و تفسیر قرآن کا درس دینے لگے، امامت کے علاوہ وہ امریکہ کے مختلف شہروں کے مسلمان فوجیوں کا نکاح پڑھانے کیلئے بلائے جاتے تھے، اور ہر مہینہ کم از کم مختلف اسلامی موضوعات پر ۹ تقریریں کرتے تھے۔

اس وقت امریکہ میں تقریباً ۱۲ مسجدیں ہیں، سب سے بڑی واشنگٹن کی نئی مسجد اور سب سے چھوٹی سکرامنٹو کے پاکستانی مسلمانوں کی مسجد ہے، سب سے پہلے ڈی ٹرائٹ کے شامی، لبنانی مسلمانوں

کی مسجد کی تکمیل ۱۹۲۲ء میں ہوئی، امریکہ کی سب سے پرانی مسجد کی تکمیل ۱۹۳۵ء میں ہوئی، جو ریاست ایوا میں ہے، نیویارک کی مسجد متوسط درجہ کی ہے، جس میں تاتاری مسلمان عموماً امامت کرتے ہیں۔

شہر لوس انجلوس میں امریکی نسل کے ایک مسلمان محمد عبد اللہ رینولڈز نے مغربی امریکہ کے ساحل پر ایک مسجد تعمیر کی، واشنگٹن کی خوبصورت مسجد میں ایک اسلامی درسگاہ اور مشرق و مغرب کے درمیان کلچرل تعاون کا ایک مرکز اور ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں دنیا کے مختلف حصوں کی ہزاروں بیش قیمت کتابیں ہیں، مرکز کے ایک حصہ میں اس کے مہتمم و منیجر کی رہائش گاہ اور درسگاہ کے ماتحت مکاتب ہیں،

۲۸ جون ۱۹۵۷ء میں صدر آئزن ہاور نے باقاعدہ سرکاری طور پر اسلامی مرکز کا افتتاح کیا اور اس میں تمام اسلامی حکومتوں اور بعض غیر اسلامی ممالک کے نمائندے، امریکی پارلیمنٹ کے ممبران، دوسرے امریکی عمائد اور سیکڑوں امریکی مسلمانوں نے شرکت کی، ان میں صدر انڈونیشیا احمد سوکارنو، شاہ ایران، شاہ سعودی عرب، اور وزیر اعظم افغانستان بھی تھے،

واشنگٹن کے اسلامی مرکز کے دروازے رمضان المبارک میں نماز تراویح کے لیے کھولے جاتے ہیں، عیدین میں سیکڑوں مسلمان نماز پڑھنے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں،

اس مرکز کی تعمیر میں ۳۰ لاکھ امریکی ڈالر خرچ ہوئے تھے، اور تمام اسلامی حکومتوں نے اس کو بنانے میں حصہ لیا تھا، سید یوسف البدالمہدی نے اس کے لیے ڈھائی لاکھ کا عطیہ دیا تھا، اس کے دونوں کناروں پر ایک وسیع باغ ہے، جس میں درخت اور پھول قطاروں میں ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اس سے مرکز کی دلآویزی اور رونق بہت بڑھ گئی ہے۔

سان فرانسسکو میں ایک ثقافتی اسلامی مرکز ہے، اس کے صدر اٹلی کے ایک طبیب کا بیٹا ہیں جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں اور خزانچی صوبہ شمالی کے ایک طبیب ہیں جو وہاں کے کسی اسپتال میں ملازم ہیں، اس کی نگراں ایک امریکن نسل کی خاتون ہیں جو اسلام سے مشرف ہو چکی ہیں، انھوں نے

اپنے بچوں کے عربی اور اسلامی نام بھی رکھ لیے ہیں لیکن خود اس کا نام ازار الیونگ ہے۔

متحدہ امریکہ کے مسلمانوں میں بڑا اتحاد و اتفاق ہے، ۱۹۵۴ء کی گرمیوں میں انھوں نے شکاگو میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی، اس میں امریکہ کی مختلف ریاستوں، ریاستہائے متحدہ و کینیڈا کی اسلامی تنظیموں کے نمایندے شریک ہوئے تھے، انھوں نے اپنی نئی تنظیم کا نام ریاستہائے متحدہ و کینیڈا کی متحدہ اسلامی تنظیم رکھا ہے، عبد اللہ عجرم کو ان کی غیر معمولی خدمات کی بنا پر اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا، ڈاکٹر محمد یوسف شوار بی نے اپنی کتاب "امریکہ میں اسلام" میں لکھا ہے کہ "عبد اللہ عجرم کو اسلامی جمعیتوں کی عام متحدہ تنظیم میں خاص فضیلت حاصل ہے، انھوں نے اپنے شہر سیڈر ریپڈز میں مسلمانوں کی پہلی کانفرنس کی۔ اس تنظیم نے اپنے دستور کی بنیاد قرآنی آیت [واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا] پر رکھی ہے، دستور کا اصل مقصد ممبروں اور ان کے آل و اولاد کے اندر اسلامی اخلاق، ثقافت اور فلسفہ کی روح پھونکنا اور اعلیٰ اسلامی تعلیمات کو چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعہ سے پھیلانا ہے، سید محمد جواد تشیری نے اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے اسلام کی ان اہم خدمات کی جانب اشارہ کیا جو اس نے دنیا میں فکری اور سیاسی اعتبار سے انجام دی ہیں، سید علی عثمان نے جو فلسطین کے باشندہ اور شکاگو یونیورسٹی میں امور شرعیہ کے پروفیسر ہیں، اپنی تقریر میں مسلمانوں سے کہا کہ "سلامتی اور امن کی راہ میں ان کی روحانی ثروت کا جو حصہ ہے، اس کا اچھی طرح مطالعہ کریں"، ایک پاکستان نژاد امریکن سید خلیل احمد نے بھی اس کانفرنس میں حصہ لیا، اور آزادی کی راہ میں عالم اسلام کی خدمات کا تذکرہ کیا، مصر کے ڈاکٹر محمود شوار بی نے بھی جو میری لینڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اس کانفرنس میں حصہ لیا،

جون ۱۹۵۵ء میں "اتحاد جمعیات اسلامیہ" نے شمالی امریکہ میں اپنی ساتویں کانفرنس کی

جس کی کارروائی ۳ دنوں تک جاری رہی، اور اس میں ۷۰۰ مندوبین نے شرکت کی، اس سلسلہ میں صدر آئزن ہاور نے کہا کہ "ہمارے ملک اور اسلامی ملکوں میں دوستی کا مضبوط رشتہ عرصہ سے قائم ہے، اسلامی تنظیم سے اس کو مزید استحکام حاصل ہوگا، کانفرنس کے اجلاس قرآن پاک کی تلاوت سے شروع ہوتے تھے،

قاسم کے اہتمام میں ٹولیڈو میں ایک ہوٹل چل رہا ہے، انھوں نے ریاست اوہو میں ایک عرصہ تک کپڑوں کی صنعت کا کاروبار بھی کیا تھا، ان کی شادی ایک مسلم خاتون سے ہوئی ہے، جو ٹولیڈو یونیورسٹی کی سند رکھتی ہیں، اور اکثر اسلامی معاملات و امور میں اپنے شوہر کی مدد کرتی رہتی ہیں،

نیویارک میں ایک بلند پایہ اسلامی مجلس کی تشکیل عمل میں آچکی ہے، اور اس میں حسب ذیل جمعیتوں کی نمایندگی ہو رہی ہے:

وادی نیل کی جمعیت اتحاد، سوڈان کی جمعیت اتحاد نبوی، شمالی افریقہ کی امریکی جمعیت، امریکہ میں پاکستانی جمعیت اتحاد، جمعیت انڈونیشیا، امریکی جمعیت اسلامی امریکی ارسالیہ اسلامیہ، امریکی جمعیت ملایا، مراکش کی عام متحدہ جمعیت، جمعیۃ شباب اسلامی اور مسلم خواتین کی جمعیۃ ثقافیہ،

شیخ وہبی اسماعیل جو البانیہ کے عالم، جامعہ ازہر کے پروفیسر اور ڈی ٹرائٹ کی جمعیت اسلامیہ کے صدر ہیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ و کنیڈا کے مسلمانوں کا ایک عام گائڈ تیار کر رہے ہیں، اگر یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو وہاں کے مسلمانوں کو اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا، اس کام کو وہ پوری محنت سے اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی شان و شوکت بلند کرنے کے لیے کر رہے ہیں، یہ گائڈ وہاں کے مسلمانوں کے درمیان اتصال کے وسائل پیدا کرنے میں

معاون ہوگا، اور عرب حکومتوں کے سفیروں کو ان مسلمانوں سے باخبر کردے گا، جو شور و ہنگامہ سے دور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے گھروں میں عربی زبان اور اسلامی امور کے متعلق خدمات انجام دے رہے ہیں،

اسلام کی بین الاقوامی جمعیۃ التعریف متعدد رسالے شائع کرنے کی تیاری کر رہی ہے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: اسلام کے بین الاقوامی تصورات، اسلام میں عورتوں کے حقوق، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کے متعلق مستشرقین اور یورپین فلاسفہ کی رائیں، ہم مسلمان کیوں ہوئے؟ موجودہ تہذیب و تمدن پر اسلام کی فضیلت، غلام اور غلامی کے متعلق اسلامی نظریہ، اسلام اور مذہبی رواداری، عالمی اسلامی بھائی چارگی، اسلام اور جمہوریت، اسلام میں آزادی، اخوت اور مساوات، بعض مسلمان ہونے والے امریکن اور یورپین ماہرین کی رائیں، جمعیت نے ان رسالوں کو جمعیۃ التعریف الدولی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد یوسف شوار بی کی ہدایت اور فرمائش کے مطابق شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سفرنامۂ مصر و شام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلیؒ نے جو سفر کیا تھا، اس کے حالات و واقعات، یہ سفرنامہ اردو میں ممالک اسلامیہ کا سفرنامہ ہے، جس میں ٹرکی، مصر اور شام کے علمی و تعلیمی و تمدنی حالات کی تصویر کھینچی ہے،

ضخامت ۱۴۲ صفحے قیمت ہے

میجر

ادبیات

دعوتِ حق

از پروفیسر سید حسن حبیب صاحب صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ساتھ دو حق کا کبھی اہل وفا تک پہنچو
دشتِ غربت میں چلو کرب و بلا تک پہنچو

گم ہوئی جاتی ہیں ظلمت میں خرد کی راہیں
تھام لو دستِ جنوں راہ نما تک پہنچو

دم گھٹا جاتا ہے تاریک فضاؤں میں یہاں
روشنی تیز کرو شمعِ ہدا تک پہنچو

مسئلے زیست کے پیچیدہ ہوئے جاتے ہیں
مردِ کامل سے ملو عقدہ کشا تک پہنچو

سایۂ بوم میں انسان ہوا رو بہ زوال
طالبِ اوج بنو بالِ ہما تک پہنچو

تم کو دھوکا ہے کہ دنیا ہوئی فردوس مثال
آنکھ کھولو تو ذرا چین و ختا تک پہنچو

باغ کا دور خزاں ہے جسے سمجھے ہو بہار
عندلیبوں کی غم انگیز صدا تک پہنچو

درس عرفاں کیلیے شمس و قمر ہیں موجود
ابن آذر کی نظر ہو تو خدا تک پہنچو

عمر جاوید کی تم کو بھی تمنا ہے اگر
خضر کے ساتھ رہو آب بقا تک پہنچو

آب زمزم سے دھلے داغ معاصی سید
روح کو پاک کرو خاک شفا تک پہنچو

غزل

از جناب یعقوب بدایونی

کیے تسخیر دنیا میں زمین و آسماں ہم نے
بنایا ہے حقیقت میں جہاں رشکِ جناں ہم نے

بڑھا دیں سرخیاں رنگینیٔ خونِ تمنا سے
مرتب اس طرح کی از سرِ نو داستاں ہم نے

زمانے میں ہماری شعلہ افشانی کا چرچا تھا
بمجبوری بدل ڈالا ہے اب طرزِ بیاں ہم نے

بکیوں آنسو چھلک آئیں یہ اجڑا دیکھکر گلشن
انہی آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ گلستاں ہم نے

پہنچتے کس طرح منزل پہ دنیائے محبت میں
سمجھ رکھا تھا رہزن کو امیرِ کارواں ہم نے

جبینِ شوق نے عظمت بڑھا دی آستانے کی
بنایا ہے تمھارے آستاں کو آسماں ہم نے

ہمیں اے کم نظر سیلِ حوادث کیا ڈراتا ہے
سمجھ رکھا ہے طوفاں کو بھی اک موجِ رواں ہم نے

محبت اپنا شیوہ ہے محبت اپنی فطرت ہے
محبت کر کے دنیا کا لیا ہے امتحاں ہم نے

بچانے کیلئے کچھ زندگی پرور بہاروں کو
نشیمن پھونک ڈالا ہے برائے گلستاں ہم نے

کسی کے اک اشارے پر لٹا دی دولتِ ہستی
محبت میں کبھی سوچا نہیں سود و زیاں ہم نے

زمانے سے شکایت ہے نہ ان سے ہی شکایت ہے
کیا خود ہی دلِ آوارہ کو بے خانماں ہم نے

نہ چھوڑا عزم کا دامن زمانے کے مظالم پر
سہے کتنے ہی غم یعقوب زیرِ آسماں ہم نے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

کچھ اس ادا سے عشق کے صدمے اٹھائیے
دل غم سے رو رہا ہو مگر مسکرائیے

ماہ وفائے عشق میں بڑھتے ہی جائیے
لیکن فریبِ دوریِ منزل نہ کھائیے

ہو جائیں حادثاتِ زمانہ بھی سرنگوں
اس طرح حادثاتِ زمانہ پہ چھائیے

ہر جذبۂ حیات کو دیکر شعورِ نو
خود زندگی کو پیار کے قابل بنائیے

ہو جس کی سادگی سے شکستِ غرورِ حسن
ایسا بھی اک فریب محبت میں کھائیے

غم بھی ہے جب حیات کا اک جزوِ لازمی
کیونکر غمِ حیات سے دامن بچائیے

فرصت کہاں ہے گریۂ بے اختیار سے
یہ تم نے کیا کہا کہ ذرا مسکرائیے

اللہ کتنی تیرہ و تاریک ہے حیات
جی چاہتا ہے شمعِ محبت جلائیے

جوہر تمام بزم جسے سن کے جھوم اٹھے
یوں آج سازِ دل پہ غزل گنگنائیے

غزل

از جناب مولوی عثمان احمد صاحب جونپوری

عرصہ سے مجھ پہ اُن کی نگاہِ کرم نہیں
یعنی دلِ حزیں پہ وہ جور و ستم نہیں

صد شکر بتکدے سے تعلق نہیں رہا
اب تو خدا کی یاد ہے یادِ صنم نہیں

رہتی ہے اس میں ایک ہی تصویر ہر گھڑی
دل کا یہ آبگینہ ہے جامِ جم نہیں

میری جبینِ شوق ترے در پہ ہے جھکی
میری زباں پہ قصۂ دیر و حرم نہیں

خود دوسروں کے غم کو سمجھتا ہوں اپنا غم
دنیا میں اس سے بڑھ کے کوئی محترم نہیں

معدوم اس طرح سے ہوا لطفِ زندگی
محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ ہم نہیں

اب بھی اگرچہ ان سے تعلق ہے برقرار
وہ نامہ و پیام مگر دم بدم نہیں

کیا خوب کہہ گیا ہے جگر شاعرِ زمن
ان کا ستم بھی انکی عنایت سے کم نہیں

اک تیرے آستاں کے سوا اے مرے خدا
عثمان کی جبیں کسی چوکھٹ پہ خم نہیں

مطبوعات جدیدہ

اسلام کا نظام آراضی ۔ از مفتی محمد شفیع صاحب، صفحات ۲۸۸، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۃ المعارف، ڈاکخانہ دار العلوم متصل کورنگی، کراچی نمبر ۳ قیمت مہر

اسلام کے معاشی نظام میں اسکے نظام آراضی کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے، مسلمانوں نے جتنے ممالک فتح کیے ان میں بغیر کسی استثناء کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام رائج تھا، اس نظام میں اس نے ایک معتدل تبدیلی پیدا کی جس کی رو سے نہ تو ہر چیز قومی ملکیت قرار پائی اور نہ انفرادی ملکیت کو بے لگام چھوڑ دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں اسلام کا قدم گیا دوسرے شعبوں کی طرح زراعت میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی، یہ افسوس کی بات ہے کہ جس کے تحت ایک ہزار برس تک دنیا کے اہم ملکوں کا نظام آراضی چلتا رہا اب اس نظام کو موجودہ معاشیات میں ایک جاگیردارانہ مردہ نظام کی طرح پڑھایا جاتا ہے اس میں خود ہمارا قصور بھی ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے کئی صدی سے نہ تو عملی اعتبار سے اس کا ثبوت دیا اور نہ علمی انداز پر اس پر خاطر خواہ کام ہوا، ادھر بیس پچیس برس کے اندر اس موضوع پر ضرور کچھ کام ہوا ہے، مگر یہ کام تحقیقی سے زیادہ صحافی انداز کا ہوا ہے، اس لیے وہ سنجیدہ حلقوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکا، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے کچھ کام شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب نے بھی اس موضوع پر اردو میں اچھا کام کیا ہے، مصر کے علماء میں سید قطب کی جامع تصانیف کے ساتھ اس کے بعض شعبوں پر شیخ ابو زہرہ اور عبد الوہاب خلاف وغیرہ نے باوزن کام کیا ہے،

زیر تبصرہ کتاب بھی نظام آراضی پر ایک بڑی قیمتی دستاویز ہے، جسے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے کئی برس کی جانکاہ محنت کے بعد مکمل کیا ہے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نظام آراضی پر اردو زبان میں اس سے زیادہ تحقیقی اور مدلل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، مولانا نے نہ صرف اسلام کے نظام آراضی پر گفتگو کی ہے بلکہ ہند و پاک میں مختلف عہدوں میں آراضی کا جو بند و بست ہوتا رہا ہے، اس پر بھی بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے، آراضی ہند کی فقہی حیثیت پر مولانا جلال الدین تھانیسری کا عربی رسالہ بہت مشہور ہے، مولانا نے مزید وسعت کے ساتھ اس کی فقہی حیثیت پر گفتگو کی ہے، اس کتاب کی اشاعت پر مصنف کے ساتھ ادارۃ المعارف بھی قابل صد ستائش ہے،

مصابیح الاسلام ۔ از گنگا پرشاد اپادھیائے، صفحات ۳۰۴، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ٹریکٹ وبھاگ آریہ سماج، چوک الٰہ آباد، قیمت صہ

اس کتاب میں مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر مختلف حیثیتوں سے گفتگو کی ہے، کتاب کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اسلام کا مطالعہ ضرور کیا ہے، مگر ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے "رنگی آنکھ" سے اس کا مطالعہ کیا ہے، غیر جانبدارانہ مطالعہ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جس چیز کا مطالعہ کیا جائے اس میں اس کے مسلمات کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ تو بجائے خود ایک جانب داری ہے، چنانچہ مصنف نے غیر جانبداری کے دعوی کے باوجود اسلام کے سارے مسلمات پر اسی انداز پر گفتگو کی ہے، جس انداز پر مستشرقین اور آریہ سماج کے لوگ کرتے ہیں، قرآن کو الہامی کتاب کہنا ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ نعوذ باللہ آپ کا کلام ہے، اور آپ بہت بڑے ادیب تھے، کلمہ میں محمد رسول اللہ کا ٹکڑا مردم پرستی ہے، یا قیامت کا تصور غلط ہے، کعبہ کی طرف رخ کرنا غلط ہے، غرض یہ کہ سارے اسلامی معتقدات پر انھوں نے نہایت ہمدردانہ انداز میں تیشہ چلانے کی کوشش کی ہے، نہ جانے ان حضرات کو اسلام کے بارے میں خواہ مخواہ رائے زنی

کرنے اور دخل در معقولات کی کیا ضرورت پیش آجاتی ہے، اس کتاب سے نہ صرف مسلمانوں کی دلشکنی و دل آزاری ہوگی بلکہ اس سے کتنے فتنوں کے دروازے کھل جانے کا اندیشہ ہے، حکومت کو اس کتاب کی اشاعت پر خاص نظر رکھنی چاہئے۔

اسلامی حکومت کے نقش و نگار۔ از مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی صفحات ۱۰۴، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مفتاحی اکیڈمی، مئو، اعظم گڈھ، قیمت: - عہ

اس رسالہ میں عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ان واقعات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان کی حق پسندی اور خدا پرستی انفرادی زندگی تک محدود نہیں معلوم ہوتی ہے، بلکہ سارا نظام خلافت اس کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، وہ ایک طرف اعلان حق اور نفاذ حق کے وقت ناقابل تسخیر قوت ارادی سے کام لیتے تھے، تو دوسری طرف جب دوسروں کی حقوق دہی اور حقوق طلبی کا مسئلہ سامنے آجاتا تھا تو وہ موم سے زیادہ نرم ہو جاتے تھے، ان واقعات کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دنیا نے کامیاب حکمراں انہی خصوصیات کی بنا پر تسلیم کیا ہے، مصنف نے عام لوگوں کے مطالعہ کے لیے یہ ایک اچھا سلسلہ شروع کیا ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی،

جہاں ہم ہیں۔ از غلام سرور صاحب صفحات ۹۲، کتابت و طباعت معمولی،

پتہ: صدر بازار، داناپور، کینٹ ضلع پٹنہ، قیمت عہ

یہ غلام سرور صاحب کی روداد قفس ہے، یہ کئی بار قید و بند کی سختیاں جھیل چکے ہیں، اس سے پہلے ان کی جیل کی ڈائری شائع ہو چکی ہے، اس کتاب میں انھوں نے جیل کے لیل و نہار کی تفصیل کی ہے، اس کے پڑھنے سے افسوس بھی ہوتا ہے اور عبرت بھی، اس میں قیدیوں کے اخلاق اور جیل خانہ کے عملہ کے کردار پر انھوں نے بڑی حقیقت پسندانہ گفتگو کی ہے، ان کی بددیانتی، رشوت ستانی اور بداخلاقی کے واقعات پڑھ کر انتہائی تکلیف ہوتی ہے، گو یہاں مجرموں کی دنیا آباد ہوتی ہے،

مگر ان میں اکثر کا ضمیر کردہ یا ناکردہ گناہ پر پشیمان ہوتا ہے، پھر یہاں یکسوئی کا ماحول بھی ہوتا ہے، اس لیے ان کی اصلاح بہت آسان بھی ہے، بشرطیکہ خود جیل کا عملہ اپنے کردار سے ان کے ذوق گناہ کو مہمیز نہ لگائے، کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

اسالیب میر۔ از محمد عبد الرشید ایم اے، ضخامت ۸۰ صفحے، کتابت و طباعت معمولی

پتہ: ریٹائرڈ لکچرر، ضیاء منزل، مغل پورہ، مراد آباد

میر کی شاعری، اسلوب اور ان کے تغزل پر ادھر چند برسوں کے اندر کافی کام ہوا ہے، اسالیب میر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں مصنف نے میر کے اسلوب پر بڑی طویل گفتگو کی ہے، ان کے خیال میں اب تک میر کی شاعری پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کے اسلوب کے بارے میں بہت کم اعتنا کیا گیا ہے، ان کے خیال میں اسکول اور کالج میں عام طور پر اردو ادب کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہو گیا ہے، اس میں تربیت ذوق اور سخن سنجی تقریباً مفقود ہے، اسلیے طلبہ میں ادب کا ذوق نہیں پیدا ہوتا، انھوں نے میر کے اسلوب پر اسی نقطۂ نظر سے لکھا ہے، ان کے نزدیک میر یاسیات کے نہیں بلکہ طنزیات کے امام ہیں، مگر ان کا طنز و مزاح اتنا بلیغ ہوتا ہے کہ ہر شخص کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، مصنف کی رائے سے اختلاف کی گنجایش تو ہے مگر ان کی یہ کوشش قابل ستایش ہے۔

پھول اور چراغ۔ مرتبہ سید اقبال احمد صاحب قمر، ۱۰۰ صفحے، کتابت و طباعت بہتر، ناشر شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس ۹۳/۱۵۲ رضویخاں، جونپور،

مشرقی اضلاع کے مشہور شاعر شفیق جونپوری مرحوم کے متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں، انکا کلام ایک طبقہ میں کافی مقبول ہے، خاص طور پر انکی غزل گوئی سے لوگوں نے اچھی خاصی دلچسپی لی ہے، انھوں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، مگر انکی شاعری کا اصل میدان غزل ہے جس میں انھوں نے کافی زور مارا ہے اور وہ کامیاب بھی ہیں، شفیق صاحب کی شاعری بارے میں ارباب نظر نے جو رائیں دی ہیں وہ بھی مرتب نے شروع میں شامل کر دی ہیں، امید ہے کہ یہ انتخاب مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہوگا،

م، ج

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	......
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	"

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،

صدیق احمد

جلد ۹۷ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۶ء عدد ۴

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمن — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

عدالتی فیصلوں میں قرائن اور ذاتی علم کا دخل — جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی — ۲۴۵-۲۶۲

مسئلۂ جبر و اختیار اور اردو شاعری — جناب مرزا صفدر علی بیگ ایم اے لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن — ۲۶۳-۲۸۳

حافظ ابو داؤد طیالسی اور ان کی مسند — جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین — ۲۸۴-۲۹۹

نواب عبد العزیز خاں عزیز اور ان کا کلام — جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب — ۳۰۰-۳۱۲

مناقب الاصفیاء — جناب سید شاہ علی ارشد صاحب اشرفی البلخی الشعیبی بہار شریف — ۳۱۳-۳۱۶

مطبوعات جدیدہ — م ۔ ج — ۳۱۷-۳۲۰

ضروری اعلان

پاکستان کے خریداران معارف اپنا چندہ بینک میں جمع کرکے اس کا ڈرافٹ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام ارسال کریں۔ اگر چندہ کا ڈرافٹ نہ بھیج سکیں تو حسب ذیل پتہ پر ساڑھے آٹھ روپے جمع کرکے اس کے وصول ہونے کی رسید دار المصنفین اعظم گڈھ بھیج دیں تو معارف انکے نام جاری کر دیا جائے گا۔

جناب سخی احمد صاحب ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سندھ۔

منیجر